

منصور عاقل

گہوارۂ سخن

منصور عاقل

بسم الله الرحمن الرحيم



آتشِ قلب سے بھڑکے ہیں جو شعلے عاقلؔ
برق بن کر مرے اشعار تک آ پہنچے ہیں

نہ جانے کب سے جنوں محوِ خواب تھا عاقلؔ
غزل سرا مرے گہوارۂ سخن سے اُٹھا

شعری مجموعہ

گہوارۂ سخن

منصور عاقل

مکتبہ اتحاد المصنفین۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۹
اسلام آباد (پاکستان)

انتساب

اپنی رفیقۂ حیات سیّدہ ناہید منصور کے نام

منصور عاقل

تعارف

نام	سید منصور عالم
تخلص	عاقل
مولد	گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (یو۔ پی)
تاریخ ولادت	۲۹ جون ۱۹۳۴ء
سکونت	اسلام آباد (پاکستان)
تعلیم	ایم۔ اے (سیاسیات) ایم۔ اے (تاریخ)
وسیلہ معاش	ملازمت حکومت پاکستان
	(ڈائریکٹر جنرل نیشنل سیونگز پاکستان)
مطبوعات	گہوارۂ سخن ۱۹۹۳ء
	برگ سبز ۱۹۹۲ء
	حرف بہ حرف ۱۹۸۱ء
	مبارک نامہ (فارسی) ۱۹۷۲ء
	خامہ خونچکاں اپنا ۱۹۶۵ء
زیر طبع	حرف محرمانہ
زیر ترتیب	دلستان قابل
ادارت	سہ ماہی افق بہاولپور ۱۹۶۶ء
	ماہنامہ اردو نامہ لاہور ۸۳-۱۹۸۲ء

نام کتاب	گہوارۂ سخن (شعری مجموعہ)
سال اشاعت	۱۹۹۳ء
تعداد (بار اول)	ایک ہزار
مطبع	طاہر پرنٹرز' ۲۲۱ فیض آباد راجہ مارکیٹ اسلام آباد فون ۴۲۳۶۵۹
کمپیوٹرائزڈ کمپوزنگ	عبدالحفیظ سواتی / آفتاب قادر عباسی
سرورق	شہزاد امجد
قیمت	

ناشر مکتبہ اتحاد المصنفین پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۹
اسلام آباد (پاکستان)

مندرجات

غزلیات

ترتیب

کرتے ہیں دعائیں زندگی کی
یہ کس بلا کا اثر حسن بے پناہ میں ہے
اجنبی سے لگتے ہیں بات بھی نہیں ہوتی
محبت کے تقاضے بے رخی سے کم نہیں ہوتے
یک جا گل و خار کر رہا ہوں
اس دل کو بار بار جو بہلا رہے آپ
سکھ جنگلوں میں دکھ کا مداوا بنوں میں تھا
اگر کہنا ہے حال دل تو بے ردو بدل کہیئے
گر ہم نگار وقت کی زلفیں سنوارتے۔
یہ درد ہے تو جان کا سودا ہی کیوں نہو۔
رہرو ہو یا کہ رہبر کامل سفر میں ہے۔
عہد شباب و شوق کی ساری ادائیں بھول جا۔
ہر شخص ہی دل دینے کو تیار لگے ہے۔
جمال دوست کے کچھ راز یوں بھی فاش ہوئے۔
پہلو بھی اس نظر کو بدلنے نہیں دیا۔
یہ میرے دامن شب میں ہے کون خواب نما۔
بس اک گھٹن ہے ہوا کی کوئی رمق بھی نہیں۔
دہر کے آشوب آب و گل میں ڈھل جانے کا نام
وہ چشم ناز جو موضوع گفتگو ٹھہرے۔

یہ کون جام تہی کردہ انجمن سے اٹھا۔
حجاب جتنے تھے سارے اٹھا گیا کوئی۔
ہلچل ہو قیدیوں میں تو زنجیر کھنچیئے۔
دیکھا جو چاہتوں کے خریدار آگئے۔
لمحے کبھی جو وصل کے یاد آئے ہیں بہت
قدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے اک شخص
آنکھوں سے تری یوں تو سبھی مست ہوئے ہیں
فصل گل آئی ہے اب کے عجب انداز کے ساتھ
دل وجد میں ہے رقص سردار کی طرح
اک نشئہ ے موج ہوا مانگ رہی ہے۔
بادلوں کو زلف زلفوں کو گھٹا کہنے کو ہیں۔
جو کبھی گلزار تھے وہ دل بھی ویرانے ہوئے۔
ہر چند ہے درد لا دوا بھی۔
رہ گذار دل سے ہم گو کشاں کشاں گذرے۔
کسی کی بزم سے اب رسم و راہ بھی نہ رہی۔
وقف حسرت بھی نہیں صرف تمنا بھی نہیں۔
وہ رہ نورد کہ بے نام و بے نشاں گذرے۔
اک ستم اور بھی ہو ترک ستم سے پہلے۔
چمن میں برسا رہی ہے مستی ہوا سراپا خمار ہو کر

نین ستارے جل اٹھے ہیں آنسو بھر بھر آئے ہیں۔
غم دل کیا جنون مدعا کیا۔
حاصل نہیں رہا غم حاصل نہیں رہا۔
عشق ہی کا غم نکلا اسے غم جہاں اپنا۔
خنداں بحد کون و مکاں کیوں نہیں ہو تم
منزل اگر نہیں ہے نہ ہو جستجو تو ہے۔
چشم محبت اللہ اللہ افسوں بھی افسانہ بھی۔
بدلے جو نہ ماحول تو نغمات کا کیا ہے۔
دل میں وہ کیوں نہیں جو نگاہوں سے دور ہے۔
حسین یاسمن و لالہ و گلاب نہیں۔
آئی جو دل میں یاد گلستاں کبھی کبھی۔
حسن تصورات ہے تصویر یار میں۔
وفا کی سعی آخر بھی اگر ناکام ہو جائے۔
میں اقرار حق برملا چاہتا ہوں۔
اب درد میں لذت ہے اب درد میں راحت ہے۔
روئے نگار صبح کہاں چشم تر کہاں۔
چہرہ بھی زرد آنکھ بھی نم آشنا نہیں۔
گذر جاؤ حدود لالہ و گل سے صبا ہو کر۔
فیصلے عشق کے تلوار تک آپہنچے ہیں۔

نہ جانے کتنے چلے جام ایک جام کے بعد۔
وجہ تسکین محبت میں ستم ہوتا ہے۔
پیانہ بکف کون یہ گذرا ہے ادھر سے۔
خزاں کا دور بھی ہر چند بے ضرر تو نہ تھا۔
دل کو اسیر لالہ و ریحاں نہ کر سکے۔
ہے تقاضا کہ ہو پھر مظہر جذبات غزل۔
کتاب دل میں پھر وہ عمر بھر پیدا نہیں ہوتے۔
ابھی جو قافلہ نو بہار گذرا ہے۔
روشن تغیرات کے امکاں ہوئے تو ہیں۔
چمن میں جشن بہاراں ہے دیکھیئے کیا ہو۔
مانوس فصل گل سے نہ تھے بستیوں کے لوگ
غم حیات کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم۔
بس یہ ہوا کہ گردش حالات تھم گئی۔
ان سے ہر چند تقابل تو نہیں ہے یارو
آتش تصور سے روز و شب سلگتے ہیں۔
کچھ سکوں بخش کچھ آلام اثر ہوتا ہے۔
جو گمان تک نہ آئے جو خیال تک نہ پہنچے۔
سوال ظرف کا ہے ذکر بے خودی تو نہیں۔
دشت غربت سے چلے ارض وطن تک آگئے۔

نہ کر جہد طلب اے دل تمنا خام رہنے دے۔
جو عشق سے بے خبر گئے ہیں۔
کعبہ دل اگر اے دوست صنم خانہ بنے۔
کچھ کیف و انبساط کے سانچے میں ڈھل گئی۔
خرد کو عشق سے اب سوئے ظن تو کیا ہو گا۔
اذن محبت عام ہے یار و جذب محبت عام کریں۔
جرات دید نہیں اذن ملاقات نہیں۔
مرے گلستان دل نے جو خزاں کا روپ دھارا
دل کی بپتا سنتے سنتے ہوش گئے اوسان گئے۔
خرد کے تیور نڈھال سے ہیں جنوں کی ہیں بیقرار آنکھیں۔
شکوۂ کم نگہی چشم عنایات سے کیا۔
نہ پوچھیئے کہ ہے کیا حال ناشکیبائی۔
نہ دشت میں نہ سر کوہ طور ہوتا ہے۔
وحشت سے تار تار گریباں کئے ہوئے۔
وہ جو کل تھا وہی دستور جہاں آج بھی ہے۔
مذاق عشق بحسن تمام پیدا کر۔
دیا غم نے نگاہ شوق کو درس وضو برسوں
ہر مشکل حیات کے قابل کہیں جسے۔
زمیں تک ہے زماں تک ہے حد کون و مکاں تک ہے۔

نہ اب فریاد سنتا ہے نہ کوئی داستاں میری۔
حسن ہر رنگ غم عشق کا عنواں نکلا۔
زیست اور موت کے سامان بدل جاتے ہیں۔
منزل عشق میں مرا طرز قیام اور ہے۔
شکست ہر قدم پر عزم مستقبل بدلتے ہیں۔
تسکین قلب و جاں کے سہارے بچھڑ گئے۔
شکیب چھین لیا اختیار لوٹ لیا۔
پیمانہ کش بادہ انگور نہیں ہوں۔
وہ آئے حریم محبت میں آئے۔
عالم تمام زیر و زبر دیکھتے رہے۔
قصہ عشق و وفا ورد زباں ہوتا رہا۔
کرم نہیں ہے عطا نہیں ہے نوازش اعتنا نہیں ہے۔
سر مقتل جو اے ہمدم پریشاں روزگار آئے۔
برق تجلیات مجھے یاد آ گئی۔
منت حسن یار کون کرے۔
عنواں کے ساتھ ساتھ فسانہ بدل گیا۔
وہ جو صبر آزما نہیں ہوتا۔
سودائے آہ نارسا کیا ہے۔

متفرقات

ترتیب

ڈاکٹر شان الحق حقی

ستارہ امتیاز

پیش لفظ

جناب منصور عاقل کا مجموعہ کلام "گہوارۂ سخن" افق ادب پر طلوع ہو رہا ہے اور میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس سے پہلے وہ اپنے مضامین کا ایک مجموعہ "حرف بہ حرف" کے عنوان سے شائع کر چکے ہیں۔ اپنی منصبی حیثیت میں وہ مدۃ العمر مالیات سے وابستہ رہے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے ذوق ادب کو کس طرح تازہ رکھا اور شاعری ان کا دامن کیونکر تھامے رہی' میرے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہم سب معاشی طور پر کسی نہ کسی مشغلے سے منسلک رہ کر ہی زندگی گزارتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آدمی صرف شاعری کا ہو کر اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ اسے زندگی کے ساتھ پوری طرح دست و گریباں رہنا چاہیے۔ وہ صرف اپنی ہی شخصی و نجی واردات کو نظم نہیں کرتا۔ دوسروں کے دل کا حال بھی کہتا ہے' ورنہ اس کی شاعری کی بساط بہت محدود رہ جائے اور اس میں آفاقیت نہ آنے پائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کاروبار زندگی سے پورا لگاؤ رکھے۔ اپنے اوپر تجربات و مشاہدات کا در بند نہ کرے' ورنہ آمد سخن کا راستہ بھی بند رہے گا۔ شاعر امن کے گنبد میں بیٹھ کر اچھی شاعری نہیں کر سکتا جس میں زندگی کی حرارت اور صداقت موجود ہو۔ "ادب اور پیشہ وری" میری نظر میں کوئی ٹیڑھا مسئلہ نہیں ہے۔ شاعری کوئی پیشہ نہیں۔ نہ یہ کوئی اختیاری مشغلہ ہے جسے اپنی مرضی سے گلے لگایا یا تیاگ دیا جائے۔ کسی فرد میں شعری جوہر ہو گا تو ضرور معرض اظہار میں آئے گا۔ دوسرے مشاغل زندگی کے درمیان اپنی جگہ خود

بنائے گا۔ اپنی راہ آپ نکالے گا۔ فرصت و آسائش کے بغیر تخلیق کے فطری تقاضے کو نبھانا یہی چیز ہے جو شاعری کو ایک آزمائش بناتی ہے۔ اس آزمائش سے گزرنا ہر شاعر کا مقدر ہے۔ زمرۂ افسران میں کتنے ہی لوگ ہونگے جو اپنے کار منصبی سے شاید کچھ زیادہ ہی وقت دوسرے مشاغل یا مکروہات دنیوی کو دیتے ہونگے۔ غم حیات کو ٹالنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ برج رمی وغیرہ وغیرہ سب اپنے لئے جگہ نکال لیتے ہیں۔ شاعری غم حیات کو ٹالنے کی نہیں بلکہ اسے اپنانے اور پالنے کی ایک صورت ہے' جس کے لئے فطری ذوق کے ساتھ وہبی تحریک کی بھی شرط ہے۔ منصور عاقل صاحب کہتے ہیں:

ثقافت و ادب و شعر کا تھا حق جن پر
وہ دن حیات کے صرف غم معاش ہوئے

میں ان کی تالیف قلب کے لئے عرض کروں گا کہ وہ دن بھی ضائع نہیں گئے۔ ویسے تو بقول غالب "بے صرفہ ہی گذرتی ہے گو ہو گرچہ عمر خضر" لیکن زندگی کا حاصل اس کے تجربات ہوتے ہیں جو شخصیت کا جزو بنتے جاتے ہیں اور شاعری شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے قلم سے اور بھی ادبی کارنامے ظہور میں آئینگے۔

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتو صد حساب باقیست

منصور عاقل کو یہ ذوق اپنے نانا سید عبدالوحید فدا مرحوم سے ورثے میں ملا اور اپنی والدہ محترمہ کی وساطت سے پہنچا جو خود بھی ذوق شعری رکھتی تھیں۔ اس ورثے میں منصور عاقل صاحب کے برادر بزرگ جناب قابل گلاؤٹھوی بھی شریک تھے۔ منصور عاقل صاحب کی سعادت مندی دیکھیے کہ انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت کو موخر رکھا۔ پہلے اپنے نانا مرحوم کے کلام

کو تلاش بسیار کے بعد مرتب کر کے شائع کیا۔ جو "برگ سبز" کے نام سے چھپا تھا۔ اس فرض سے ادا ہونے کے بعد اب اپنے مجموعے کی ترتیب و اشاعت کی طرف توجہ کی ہے۔

ہمارے دور میں غزل نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ غزل گو شاعروں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوا ہے اور سامعین کا دائرہ بھی اب محلوں اور بستیوں سے گزر کر بین الاقوامی اجتماعات و نشریات تک پھیل گیا ہے۔ غزل کی اس مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ اول تو اس صنف میں مشق سخن نسبتاً سہل ہے۔ غزل کی بنیادی اکائی بیت ہے' یعنی دو مصرے' مقفیٰ یا غیر مقفیٰ ۔ دو دو مصرعوں کا ایک مختصر سلسلہ غزل بن جاتا ہے۔ یہ دس بیس یا سو پچاس مربوط و مسلسل مصرعوں کے مقابلے میں زیادہ طویل آمد کا متقاضی نہیں ہوتا۔ دوسرے غزل کے دامن میں مسلمہ روایات اور اس کے ساتھ لغات و مصطلحات' معتقدات و تصورات کا ایک سلسلہ ہے جو گویا ایک مشترک سرمایہ ہے جس سے ہر ایک کو استفادے اور بقدر ضرورت تصرف میں لانے کا حق ہے۔ ایسا نہیں کہ تمام غزل اسی طرح کی مشق شعرگوئی پر ختم ہو جاتی ہو۔ نئے خیالات' نئے موضوعات اور اظہار کے نئے پیرائے بھی ضرور مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ غزل صرف پھیلی ہی نہیں' آگے بھی بڑھی ہے۔ لیکن یہ روایتی سرمایہ عام طور پر غزل گوئی میں مدد گار ہوتا ہے۔ نئے اسالیب بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ کاری بھی جدید غزل میں ضرور موجود ہے۔ وقیع اور سچی غزل کی پرکھ اسی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اس مجموعے میں بھی نظر آئے گی۔ جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ تنقیدی عمل ایک طرف --- اور اس کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ ادب و شعر پر کئی طرح کے تنقیدی عمل کئے جاتے ہیں' لیکن شعر کی اصل پرکھ اس کی تاثیر

سے ہوتی ہے۔ یعنی آپ پر اس کا بے ساختہ ردعمل۔ آپ نے شعر پر سر ہلایا' اسے مزہ لے کر پڑھا' اس نے آپ کی سوچ یا جذبے کو ٹھوکا دیا' یا آپ کے منہ سے واہ واہ سبحان اللہ نکلا' تو یہی کلمات ساری تنقید کا نچوڑ ہیں۔ شعر و ادب کی بابت نظریات کی کمی نہیں۔ گو یہ کسی ایک نظریے کی گرفت میں نہیں آتے۔ آپ اپنے ذوق' افتاد و نژادیا معتقدات کی بنا پر ادب کی جو بھی تعریف کریں اس کا اصل جوہر ایک قدر مشترک ہے جسے ایک لفظ "تحیر" سے تعبیر کر سکتے ہیں' یعنی کمال کا پہلو جو ایک طرح کی حیرت پیدا کرے کہ الفاظ میں یہ تاثیر' یہ لطف' یہ خوبی' یہ جادو کیونکر پیدا ہوا۔ اچھے شعر کی بابت کہا جاتا ہے کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" ۔ اچھا شعر وہ ہے جو آپ کے دل کو لگے۔ اچھا کلام وہ ہے جسے آپ پڑھنا اور سننا پسند کریں۔ مجھے منصور عاقل کے اس شعر نے خاصا چونکایا:

تمام عمر پڑھوں بھی تو پڑھ نہیں سکتا
بسی ہے دل میں جو اک صورت کتاب نما

یہاں کوئی روایتی مضمون ہے' نہ معاملہ بندی۔ اس کو تازہ کاری کہتے ہیں۔ شعر کا مفہوم خاصا گہرا ہے۔ ہر پر تخیل انسان اپنے اندر ایک آئیڈیل رکھتا ہے جس کے خدوخال موہوم ہی ہوتے ہیں اور ساری عمر اس کی پہچان یا تلاش میں گزرتی ہے' کیونکہ آئیڈیل قابل حصول یا سہل الحصول نہیں ہوتا۔ شخصیت جتنی پختہ ہو گی آئیڈیل بھی اتنا ہی بلند اور ناقابل حصول ہو گا۔ آپ اسے اپنے خیال میں ہی بسائے رکھتے ہیں' اور وہ تمام و کمال گرفت میں نہیں آتا۔ مگر آج بھی دنیا چند تصورات ہی کے سہارے چل رہی ہے۔ جو ذہنوں میں ہیں خواہ حقیقت نہ بن سکے۔ مثلاً انسانی برادری یا "ایک دنیا" (عالمی وحدت) کا تصور یہ تو ایک اجتماعی آئیڈیل کا ذکر تھا۔ لیکن شعر میں تعمیم

کی بڑی گنجائش ہے۔ انسانوں کے اپنے اپنے انفرادی آئیڈیل بھی ہوتے ہیں۔ چہرے کے ساتھ "کتاب نما" کی ترکیب بڑی برجستہ ہے۔ ایک اور جگہ کیا خوب کہا ہے:

عاقل کشید کیجیئے ذروں سے آفتاب
ظلمت سے نور سائے سے تنویر کھینچیے

اس اجمال کی تفصیل بھی بڑی لمبی چوڑی ہو سکتی ہے اور کئی رخ سے ہو سکتی ہے، لیکن غیر ضروری ہے، پڑھیئے اور لطف لیجئے۔ یہاں بات اس سطح پر ہے (اور یہ بھی اس کا صرف ایک رخ ہے) کہ انسانی ترقی ایسی ہی کیمیا گری سے عبارت رہی ہے۔ بقول اقبال

"من آنم کہ از نیش نوشینہ سازم"۔

یہ تو کلام کی فکری سطح تھی۔ غزل کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ وہ فکری مضامین کو بھی عموماً" تغزل کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتی اور اسی عمل سے غزل بنتی ہے۔ عاقل کے ہاں جذباتی کیفیات و واردات بھی لازماً" موجود ہیں:

دیکھا کیئے ہمیں وہ کنکھیوں سے بار بار
ہم نے نظر ملائی تو شرمائے ہیں بہت

خود فریبی کا بھی کیا عالم تھا اے عاقل کہ جب
ان سے ہر لحظہ محبت کا گماں ہوتا رہا

اسی زمین کا ایک اور شعر بھی خوب ہے:

بجلیاں آغوش گردوں میں جواں ہوتی رہیں
اور ادھر تیار اپنا آشیاں ہوتا رہا

جدید غزل کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے جامد تصورات کی جگہ شک کو راہ دی ہے۔ اپنے نفس کو ٹٹولنا۔ بروں بینی کے ساتھ دروں بینی۔ روایتی شاعر یہ مضمون نہ باندھتا کہ گویا محبت ایک خود فریبی بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کو جو چیز انسان بناتی ہے دولت درد ہے۔ جسے جتنی مل جائے۔ بقول خواجہ میردرد' انسان اسی کے لئے پیدا ہوا تھا۔" ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں۔" فانی نے کہا تھا:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تونے دیا دل بجھا ہوا

عاقل نے مضمون کو ترقی دی ہے کہتے ہیں:

اللہ نے دی ہے جو مجھے درد کی دولت
ہمت مری اس سے بھی سوا مانگ رہی ہے

شاعری کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ یہ مثالی اقدار اور مثالی کردار کا نقش آپ کی آنکھوں کے سامنے رکھتی ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ انسان خواہ انسان نہ بنا ہو' انسانیت کا تصور اور کچھ مثالی اقدار ضرور موجود ہیں۔ یہی انسانی تہذیب کا خلاصہ ہیں۔

شاعری خصوصا" غزل کی خصوصیت خاصہ یہی ہے کہ اس میں دلی جذبات اظہار پاتے ہیں۔ ضمیر میں چھپے ہوئے راز' خلشیں اور الجھنیں شعر کی صورت میں ڈھلتی ہیں تو ان سے ایک طرح کا رد فشار ہوتا ہے۔ شعر کہنے کے بعد جو شاعر کو ایک طرح کی فرحت یا مسرت محسوس ہوتی ہے۔ (خواہ اس نے کوئی حزنیہ نظم ہی لکھی ہو یا حسرتناک مضمون باندھا ہو) اس کا سبب بھی یہی تسکین خاطر ہے۔ جو تخلیق سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا دل پر سے ایک بوجھ اٹھ گیا۔ ان اشعار میں یہی لطیف نکتہ ہے۔

زندگی اک راز سربستہ تھی افشا ہو گئی
دل کے افسانے حدود شعر و فن تک آگئے
گردش دوراں نے عاقل توڑ دی مہر سکوت
فکر کے اسلوب انداز سخن تک آگئے

اس انتخاب کو طول دینا محض طول کلام ہو گا کیونکہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے اور پڑھنے والے اس چمن زار سے بقدر ذوق گل چینی کر سکتے ہیں۔

منصور عاقلؔ

میری شاعری

اگر میں یہ کہوں کہ شاعری مجھے ورثہ میں ملی ہے تو کچھ ایسا غلط بھی نہ ہو گا کیونکہ میرے نانا سید عبدالوحید فدا مرحوم ایک بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا شمار داغ کے نورتنوں میں ہوتا تھا خواب و خیال کی طرح ان کی شبیہ میرے ذہن میں محفوظ ہے لیکن شعر و ادب کا وہ ماحول جو ان کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کا فیضان تھا میرے تصورات کے افق کو آج بھی جگمگائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چالیس پینتالیس برسوں سے شعر کہنے کے باوجود میں نے اپنا کلام محض اس لئے طبع کرانا مناسب نہ سمجھا کہ فدا صاحب کا کلام طبع ہونا تو کجا کہیں دستیاب تک نہ تھا اور وہ اور ان کی شاعری ان کے انتقال کے بعد سے مسلسل ذہنوں سے محو ہوتے جا رہے تھے خدا کا شکر کہ سالہا سال کی کاوش کے بعد میں ان کے بارے میں مستند معلومات اور بیشتر کلام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا چنانچہ گزشتہ برس ہی مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ "برگ سبز" کے نام سے ان کا انتخاب کلام نقد و نظر کے جائزوں کے ساتھ طبع کرا سکا جسے الحمد اللہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی میں نے جس گود میں پرورش پائی وہاں بھی مجھے شاعری کی گونج سنائی دی میری والدہ مرحومہ بھی شاعرہ تھیں اور میرے بھائی علامہ قابل گلاؤٹھوی نے برصغیر میں اپنی ذہانت اور جودت طبع کے باعث شاعری میں نام پیدا کیا اور بدیہہ گوئی کے سبب علمی و ادبی حلقوں میں بلند مقام حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ اس پس منظر کے ساتھ میری تعلیم و تربیت میں جو عوامل کار فرما رہے ان میں شعر و ادب سے وابستگی کو نمایاں حیثیت

حاصل ہے۔
شعر گوئی کے حوالے سے میرے نزدیک طبع موزوں اکتسابی نہیں بلکہ قدرت کا عطیہ ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں بھی اگر کوئی شعر ناموزوں یا ساقط الوزن پڑھتا تو مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آج تک فاعلاتن فاعلات کی گردان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی میں ارادۃً" تو شعر گوئی کا آغاز کیا کرتا البتہ ساتویں جماعت ہی سے شعر موزوں ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن بعد کے تجربے اور مطالعہ سے کھلا کہ شعر کہنے کے لئے صرف طبع موزوں ہی کافی نہیں ہے بلکہ شعور و ادراک کی صلاحیتوں کو مطالعہ و مشاہدہ کی بصیرت آفریں اکتسابی کاوشوں سے اجاگر کرنا بے حد ضروری ہے اس سلسلہ میں شعر اور شعر کے تخلیقی عمل کے بارے میں میں اپنے نظریات کا اظہار ان ادبی و تنقیدی مضامین میں کر چکا ہوں۔ جنہیں اردو اکادمی بھاولپور "حرف بہ حرف" کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کر چکی ہے چنانچہ میرے اپنے نقطہ نظر کے مطابق "شعر انسانی ذہن کے داخلی تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن شعر کی تخلیق میں خارجی عوامل کی کار فرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا زندگی جس طرح گوناگوں مظاہر اور متنوع اشکال سے عبارت ہے۔ اسی طرح انسانی جذبہ و تخیل کے بے شمار موضوعات ہیں جو فن کے نت نئے رنگوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ زندگی جب بھی کوئی رخ بدلتی ہے یا کسی مخصوص رنگ کو ظاہر کرتی ہے تو ایک فن کار کا ذہن اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتا وہ زندگی کے ان تازہ حقائق کو ذہنی تحلیل و تجزیہ کا موضوع بناتا ہے اور اس طرح جو نتائج اس کے تخلیقی اضطراب سے متصادم ہوتے ہیں وہ فن کو جنم دیتے ہیں۔"
شعر کی تخلیق کے لئے چونکہ میں صرف طبع موزوں ہی کو کافی نہیں

سمجھتا اس لئے شعر کے ایک مخصوص معیار فن کا بھی قائل ہوں چنانچہ زیر نظر مجموعہ میں ۱۹۴۹ء اور اس کے بعد کی شعری کاوشیں شامل ہیں جو ۱۹۹۳ء تک حصول آزادی کے بعد کے کم و بیش پینتالیس برسوں پر محیط ہیں ان پر نظر ڈالنے سے کسی بھی قاری یا ناقد کو نہ صرف شاعر کے جذباتی اور فکری زاویوں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے بلکہ شاعر کے ذہنی ارتقاء اور شعر پر بحیثیت فن اس کی گرفت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میری شعر گوئی کے ابتدائی برسوں میں میرے کلام پر خاص طور پر کلاسیکی رنگ غالب نظر آئے گا۔ ہرچند کہ الفاظ و تراکیب اور اسلوب کے ذریعے نیا پن اور تازگی پیدا کرنے کی ایک شعوری کوشش بھی بیک وقت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اپنے طالب علمی کے دور میں مجھے شعر و ادب کا مطالعہ کرنے کا خاصہ موقع ملا اور میں نے باقاعدہ تجزیاتی انداز میں عہد بہ عہد اردو شاعری کے ارتقاء اور اس کے پس منظر میں کار فرما عوامل کو سمجھنے کی کوشش کی چنانچہ اسی عمل کے دوران غیر شعوری طور پر مختلف اساتذہ کے اسالیب اور انداز ہائے فکر سے متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پچاس کی دھائی میں بالخصوص اس مجموعہ میں متعدد غزلیں ایسی ملیں گی جو اساتذہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں اسی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی محفلوں نے بھی فکر کو مہمیز کیا اور معاصرین کے دوش بدوش عصری رجحانات سے خوشہ چینی کا عمل بھی جاری رہا اصل میں ذہنی ارتقاء کی سمت متعین کرنے میں یہی عوامل رہنما کردار ادا کرتے ہیں۔

جملہ اصناف سخن میں غزل اور صرف غزل ہی ہمیشہ میری دلچسپی کا موضوع رہی اس کی وجہ تو غالباً" یہ ہو سکتی ہے کہ تمام شعری تاریخ میں جو مقام و مرتبہ اس صنف کو حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو نہیں اس کے

علاوہ افتادِ طبع کو بھی ایک سبب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ میں اپنی ذات کے حوالے سے یہ بخوبی جانتا ہوں کہ زندگی کا کوئی بھی رخ ہو وہ غزل کے پیکر میں ڈھل کر اس قدر حسین اور دلکش ہو جاتا ہے کہ میرے لئے جمالیات کا اس سے ارفع شعور ممکن نہیں۔ ہر عہد میں اگرچہ غزل کو مخصوص زاویہ ہائے نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے اور اجزائے ترکیبی و ہیئت کے مسائل بھی نت نئے انداز میں سامنے آتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ غزل میں جذباتی، فکری اور معنوی آفاقیت کو سمو لینے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے عہد بہ عہد کے مختلف نقطہ ہائے نظر کے باوجود میں غزل کے پیکر میں کوئی بھی ایسی تبدیلی لانے کا متحمل نہیں ہو سکتا جو اس کی لطافت کو مجروح کرنے کا سبب بنے۔ غزل کے مزاج کی مناسبت سے الفاظ و تراکیب کا ایک ایسا عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آچکا ہے اور آرہا ہے جو ہر نوع کے تاثر اور معانی کو واضح کرنے پر پوری طرح قادر ہے اگر اسے روایت پسندی کہا جاتا ہے تو اس روایت کے احترام کو میں اپنا شاعرانہ فرض منصبی سمجھتا ہوں میں نے ہمیشہ ہر ایسی کاوش سے پرہیز برتا ہے جس کے نتیجہ میں نام نہاد ترقی پسندی کا سہارا لے کر یا جدت و جدیدیت پسندی کے جنون میں لوگ غزل کے ظاہر ہی کو نہیں باطن کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ ایمائیت و رمزیت اور تشبیہ و استعارہ سے غزل کا حسن دوبالا ہوتا ہے جبکہ نامانوس الفاظ و تراکیب سے شعر کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات انفرادی نقطہ نظر کی سہی لیکن مجھے اصرار اسی پر ہے۔

غزل میں موضوعاتِ فکر کا جہاں تک تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ غزل کی اساس باطنی تجربات اور داخلی کیفیات پر قائم ہے غزل کی روح غنائیت اور جذبات کی لطیف ترجمانی میں پوشیدہ ہے بنیادی طور پر میں بھی اسی

خیال کو درست سمجھتا ہوں ایک زمانے میں اس خیال کو ادب برائے ادب کا ضامن قرار دیا گیا اور جب بحث چھڑی تو ایک طبقہ ادب برائے زندگی کا ترجمان بن بیٹھا۔ حالانکہ ادب کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ ادب میں اور بالخصوص غزل میں موضوعات کی کوئی قید نہیں البتہ اسلوب و اظہار کی شائستگی اور مخصوص لب و لہجہ کی پابندی ادب اور غیر ادب کا تعین کرتے ہیں شاعر کے ذہنی افق پر ان گنت پر چھائیاں تخیلات و جذبات کے حوالے سے نمودار ہوتی ہیں ان کا تعلق باطنی کیفیات سے بھی ہوتا ہے اور خارجی عوامل سے بھی اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ فکر و احساس کے دھارے صرف ایک ہی سمت میں بہہ رہے ہوں میری اک غزل کا مقطع ہے۔

غم ہستی سے سرتابی کسی صورت نہیں ممکن
غزل ہر چند عاقل نغمہ الہام ہو جائے

مجھے اعتراف ہے کہ میرے اس مجموعہ کلام میں طویل وقفوں پر مشتمل سناٹوں کا احساس ہوتا ہے یعنی جیسا کہ مختلف غزلوں پر مندرج تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے مجھے شعر کہے کئی کئی سال گزر جاتے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر گوئی کا سلسلہ منقطع ہونے کا نام نہیں لیتا اس کے ذمہ دار میرے ذاتی حالات و ماحول کو قرار دیا جا سکتا ہے ادب کا مطالعہ اور شعر گوئی میرے پسندیدہ ترین مشاغل رہے ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی اپنے فرائض منصبی پر فوقیت نہیں دی اسی طرح ان مشاغل کو اپنی سماجی اور معاشی ذمہ داریوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ البتہ شعر و ادب سے جب بھی ذہنی و فکری فاصلے پیدا ہوئے مجھے ایک تخلیقی زیاں کا احساس ضرور ہوا۔ میرا یہ شعر غالباً میرے اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔

ثقافت و ادب و شعر کا تھا حق جن پر
وہ دن حیات کے صرف غم معاش ہوئے

ملازمت کے سلسلہ میں ملک بھر میں میرے رابطے رہے تقریباً ہر بڑے شہر میں قیام رہا ادبی ہنگامہ آرائیاں رہیں طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں شرکت کی۔ میڈیا سے بھی واسطہ رہا لیکن نہ جانے کیوں خود کو مسلسل منظر عام پر دیکھنے سے گریز رہا شاید اس خیال سے کہ میں نے خود کو کبھی پروفیشنل شاعر نہ بنایا نہ سمجھا البتہ تقریباً نصف صدی کے اس ادبی سفر میں ہمیشہ میری مخلصانہ پذیرائی ہوئی یہی وجہ ہے کہ اپنا "اندوختہ شعری" نذر قارئین کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

"ورنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے۔"

کچھ ان سے شکایت کا ارادہ بھی نہیں تھا
یارو مرا غم اتنا زیادہ بھی نہیں تھا

کچھ نقش تھے یادوں کے تو کچھ حرف وفا تھے
ایسا ورق دل کوئی سادہ بھی نہیں تھا

جب ہم نے اٹھائے تھے قدم دشت وفا میں
منزل بھی نہیں تھی کوئی جادہ بھی نہیں تھا

پتھر کہ مجھے دے گئے اک خلعت گل رنگ
ورنہ مرے تن پر تو لبادہ بھی نہیں تھا

میخانہ و مینا تو کہاں شہر میں تیرے
میرے لئے اک جرعۂ بادہ بھی نہیں تھا

خشک ایسا کٹا اب کے یہ برسات کا موسم
ساغر کوئی برطاق نہادہ بھی نہیں تھا

یہ زیست کی بازی تھی کہ شطرنج تھی عاقل
جب مات ہوئی ایک پیادہ بھی نہیں تھا

اسلام آباد
۱۸ مئی ۱۹۹۲ء

نہ ہم بہار کے حق میں نہ ہم خزاں کی طرف
صلیب اٹھا کے چلے ہیں فصیل جاں کی طرف

سفر ہی ہم نے کڑی دھوپ میں پسند کیا
نظر اٹھا کے بھی دیکھا نہ سائباں کی طرف

رکھا گیا مجھے محروم التفات تو کیوں
کہ بجلیوں کا تھا رخ میرے آشیاں کی طرف

امید ہی نہ ہو جن سے تو ان سے شکوہ کیا
نہیں ہے روئے سخن بزم دوستاں کی طرف

فغاں کہ ارض و سما میں نہیں سکون کہیں
ستم کہ اہل زمیں بھی ہیں آسماں کی طرف

منافقت کی بھی ہوتی ہے کوئی حد یارو !
زباں نہ دل کی طرف ہے نہ دل زباں کی طرف

پہنچ سکے نہ معانی کے درد تک عاقل
نگاہ جن کی تھی رنگینی بیاں کی طرف

اسلام آباد
۲۶ مئی ۱۹۹۲ء

درد شب فراق کا درماں کوئی تو ہو
خلوت میں فرش دل پہ خراماں کوئی تو ہو

پھر ظلمتوں سے دست و گریباں کوئی تو ہو
آخر طلوع صبح کا امکاں کوئی تو ہو !

کوئی تو ہو کہ ہو جسے احساس گمرہی
اس قافلے میں سر بگریباں کوئی تو ہو

لو دے اٹھے ہیں آج کی شب داغہائے دل
محفل سجی ہوئی ہے غزل خواں کوئی تو ہو

شبنم ہنسی پہ گل کی نہ روئے تو کیا کرے
اس بے خبر کے حال پہ گریاں کوئی تو ہو

خوشبو ہوا کے دوش پہ بھیجوں کہ برگ گل
تجدید رسم و راہ کا ساماں کوئی تو ہو

عاقل چلے ہو دیدہ ویراں لئے ہوئے
موتی سجا ہوا سر مژگاں کوئی تو ہو

اسلام آباد
۹ اگست ۱۹۹۲ء

پھر جنوں کا سلسلہ جنباں ہے مرے آنگن میں
بارش حبیب و گریباں ہے مرے آنگن میں

چاندنی اوڑھ کے چپ چاپ جو سویا ہے کوئی
چاند کیوں خوف سے لرزاں ہے مرے آنگن میں

صر صر غم جو چلی ہے تو ہے کچھ دیر ابھی !!!
موسم گل کا بھی امکاں ہے مرے آنگن میں

داغ یوں دل کے فروزاں ہیں کہ جگنو جیسے
اک عجب جشن چراغاں ہے مرے آنگن میں

آج کی رات ستاروں میں مچی ہے ہلچل
آج کی رات وہ مہماں ہے مرے آنگن میں

دوش پر دوڑتے لمحوں کے کوئی آیا ہے !
میں ہوں اور عمر گریزاں ہے مرے آنگن میں

آ کے بیٹھے ہیں وہ ڈالے ہوئے چہرے پہ نقاب
اک چراغ تہہ داماں ہے مرے آنگن میں

جب سے لائی ہے صبا پیرہن ناز کی بو
نکہت گل بھی پریشاں ہے مرے آنگن میں

میرے کانوں میں جو گھنگرو کی صدا آتی ہے
دیر سے کوئی تو رقصاں ہے مرے آنگن میں

کس کو لے آیا ہے پھر میری وفاؤں کا خیال
کون شرمندہ احساں ہے مرے آنگن میں

اک عجب معرکہ سخت ہے درپیش عاقل
میں ہوں اور گردش دوراں ہے مرے آنگن میں

اسلام آباد
۷ اگست ۱۹۹۲ء

سوچ کے بیاباں میں ذہن نارسا ہے گم
محمل نفس ہی کیسا ناقہ صدا ہے گم
بے نشاں سہی پھر بھی راستے مہکتے ہیں
اے خرام ناز آخر کس کا نقش پا ہے گم
کیا خبر ہے کب یارو موج وقت لے ڈوبے
اک سفینہ جاں ہے اور ناخدا ہے گم
کس مقام پر آ کر کارواں سے بھٹکے ہیں
اف رے گنبد صحرا بانگ ہر درا ہے گم
عقل ساتھ کیا دے گی دل کو رہنما کیجئے
دور ہے وہ منزل بھی اور راستہ ہے گم
کس یقین سے نکلا تھا دل تلاش میں تیری
تجھ کو بھی نہیں پایا خود بھی ہو گیا ہے گم
نطق و لب ہوئے پسپا ان کے روبرو عاقل
شرح عشق کیا کیجئے حرف مدعا ہے گم

اسلام آباد
۱۵ جون ۱۹۹۲ء

رہین درد ہیں ہم لوگ ہیں ستائے ہوئے
محبتوں کے مسلسل فریب کھائے ہوئے

لبوں پہ موج تبسم جو تھے سجائے ہوئے
وہی تھے زیر قبا بجلیاں چھپائے ہوئے

ہمارا حال تو دیکھو ہمیں خبر بھی نہیں
کہ اک زمانہ ہوا ہم کو مسکرائے ہوئے

ہماری سادہ دلی کی بھی انتہا ہے کوئی
جو دل شکن ہے اسی سے ہیں دل لگائے ہوئے

زمانے بھر کے خداوند بن کے بیٹھے ہیں!
یہ بت ہمارے ہی ہاتھوں کے ہیں بنائے ہوئے

میں کیا کروں کہ مروت مری سرشت میں ہے
وگر نہ یار مرے سب ہیں آزمائے ہوئے

اسی سبب سے جھکی ہے کمر ضعیفوں کی
تمام عمر کا یہ بوجھ ہیں اٹھائے ہوئے
وہ ہنس کے خود ہی پشیماں ہوئے تو کیوں عاقل
یہ زخم دل میں انہیں کے تو ہیں لگائے ہوئے

اسلام آباد
۲۱ اگست ۱۹۹۲ء

رہیئے شریک وقت کے دھاروں کے ساتھ ساتھ
ہیں منزلیں بھی راہ گذاروں کے ساتھ ساتھ
کچھ احتیاط جیب و گریباں بھی چاہیئے
چرچے بھی ہیں جنوں کے بہاروں کے ساتھ ساتھ
اک آفتاب تازہ کی دل میں لئے کسک
ہم رات بھر چلے ہیں ستاروں کے ساتھ ساتھ
طغیانیوں سے بچ کے نکل آئے تھے جو لوگ
ڈوبے ہوئے ملے ہیں کناروں کے ساتھ ساتھ
دامن میں **بجلیوں** کے ہے موسم بہار کا
کچھ پھول بھی کھلے ہیں شراروں کے ساتھ ساتھ
انجم کئے روانہ شب ماہتاب نے
دوشیزہ سحر کے اشاروں کے ساتھ ساتھ
کس پیکر جمال کی آمد چمن میں ہے ! ! !
نظریں بھی رقص میں ہیں نظاروں کے ساتھ ساتھ

اپنی صلیب دوش پہ خود ہی اٹھائیے ! ! !
چلتا ہے کون درد کے ماروں کے ساتھ ساتھ
یاروں میں ہے کمال ہنر مصلحت مگر
عاقل سا بے ہنر بھی ہے یاروں کے ساتھ ساتھ

اسلام آباد

۲۴ اگست ۱۹۹۲ء

اے نشاط آرزو پھر دل کو شرمندہ نہ کر
اس سفیر غم کو تو اپنا نمائندہ نہ کر

آنے والے مجھ میں اتنی تاب نظارہ کہاں
ہو سکے تو میرے غم خانے کو تابندہ نہ کر

ریت کی دیوار کا سایہ کوئی سایہ نہیں
مضمحل بنیاد پر تعمیر آئندہ نہ کر

اے طبیب غم نہ کر زخم محبت کا علاج
اے مسیحا کشتگان ہجر کو زندہ نہ کر

تو مرے کشکول شب میں ڈال دے کوئی کرن
بخل نور اتنا بھی اے ماہ درخشندہ نہ کر

ہو جہاں انساں پئے آزار انساں اے خدا
تو مجھے اس شہر رسوائی کا باشندہ نہ کر

کر نہ اب یاروں سے عاقل بے وفائی کا گلہ
خود بھی شرمندہ نہ ہو ان کو بھی شرمندہ نہ کر

اسلام آباد
۲۹ اگست ۱۹۹۲ء

دیوانے ہیں کہ جن کو ہے دیوانگی پسند
ہم کو نہیں بہار میں آشفتگی پسند

وہ بد نصیب جن کو گلستان سے بیر ہے
وہ کیا کریں گے لالہ و گل کی ہنسی پسند

دل میں کسی کی حسن توجہ کے زخم ہیں
ہم کیا کریں کہ ہم کو ہے بیگانگی پسند

ہر آفتاب رخ پس گیسو گہن میں ہے
یہ پیکران نور ہیں کیوں تیرگی پسند

احسان کیوں اٹھائیں مئے مستعار کا
لبریز جام مے سے ہے جام تہی پسند

بس اتنا فرق رسم وفا و جفا میں ہے !
اک میرا انتخاب ہے اک آپ کی پسند

اس گومگو سے کام چلے گا نہ عشق میں !
طے کیجئے کہ موت ہے یا زندگی پسند

اک اژدہام بے خبراں ہے یہاں کو جو
جہل خرد کے زور پہ ہے آگہی پسند

تخلیق ہر وجود کا حسن سبب سہی
لیکن خود آدمی کو نہیں آدمی پسند

منزل کی اب کسی کو خبر ہے تو ہم کو ہے
ہم خضر شوق لاکھ سہی گمرہی پسند

عاقل زہے نصیب ہوئے ہیں وہ مہرباں
کچھ بات ہم میں تھی کہ انہیں آ گئی پسند

اسلام آباد
۲۷ اپریل ۱۹۹۲ء

ساحل نگاہ میں ہو جو طوفاں دکھائی دے !!
مشکل کو چاہیئے کہ وہ آساں دکھائی دے
تو ہو تو دشت میں بھی گلستاں دکھائی دے !
تیرے بغیر شہر بھی ویراں دکھائی دے !
کچھ اس طرح بہار کا امکاں دکھائی دے
دامن دکھائی دے نہ گریباں دکھائی دے
بہہ جائے ہو کے خون دل ناکام اس طرح
اک موج سرخ برسر مژگاں دکھائی دے
رندوں کے واسطے جو در میکدہ ہو باز ! !
شیشوں میں قید گردش دوراں دکھائی دے
آ جائے وہ جمال سراپا جو روبرو ! ! !
پروانہ وار شمع شبستاں دکھائی دے ! !

اک بار ان کی دید ہو اور اذن عام ہو ! !
یہ کائنات حشر کا میداں دکھائی دے
تنقید کر رہے ہیں جو پست و بلند پر !
اے کاش ان کو اپنا گریباں دکھائی دے
قائم ہمارا رشتہ جاں ہے سفر کے ساتھ
ایسا نہ ہو کہ منزل جاناں دکھائی دے ! ! !
یا رب مجھے بصیرت انوار کر عطا ! ! !
جب تک کہ کوئی جلوہ تاباں دکھائی دے
عاقل مجھے نصیب ہو وہ جنبش نگاہ ! !
بدلے میں جاں بھی جائے تو ارزاں دکھائی دے

اسلام آباد
۲۴ مئی ۱۹۹۲ء

دل شکستہ کے اسرار کھولتا ہے کوئی
سلے ہیں لب تو نگاہوں سے بولتا ہے کوئی

یہ اشک ریزیٔ شبنم ہے یا فشارِ سحر
کرن کرن میں جو موتی سے رولتا ہے کوئی

یہ کیا ہوا ہے تمہیں تاجرانِ دیدہ و دل
کہ پتھروں سے بھی آئینے تولتا ہے کوئی !

کچھ اس طرح تو نہ تھیں دل کی دھڑکنیں پہلے
کہ جیسے آپ کے لہجے میں بولتا ہے کوئی

یہ جام مے ہے اسے اتنی بے رخی سے نہ دے
کہیں شراب میں بھی زہر گھولتا ہے کوئی

بجا کہ وعدہ فردا ہوا مگر عاقلؔ
ہمارے صبر کی مانند ڈولتا ہے کوئی

اسلام آباد
۲۵ جولائی ۱۹۹۲ء

عجب ٹوٹی قیامت آسمان فتنہ جو ٹوٹا
کہ جب کل رات میرے ہاتھ سے گر کر سبو ٹوٹا

وہ بولا تھا تو کچھ شعلے سے لپکے تھے مری جانب
ہوا خاموش تو اس بت کا سحر گفتگو ٹوٹا

ذرا اک حوصلہ یہ سنگ نفرت تھم ہی جائیں گے
نہ بچ پائے گا کوئی آئینہ اے دل جو تو ٹوٹا !

شکستہ شیشہ دل ہی نہیں ان کے تغافل سے
انہیں کی بے رخی سے رشتہ ہر آرزو ٹوٹا !

سنی واعظ کی ہم نے رات بھر تقریر بے معنی
خدا کا شکر دن نکلا تو زور گفتگو ٹوٹا ! !

لگی کس کی نظر کیا جانیئے ہونٹوں تک آتے ہی
کہ پیانہ ترے پیاں کی صورت ہو بہو ٹوٹا

جب اک رند خرا باتی نے پٹکا ہاتھ سے ساغر
بھری محفل نے دیکھا اور میرے روبرو ٹوٹا !

سدا رہتے نہیں دن ایک سے غم ہو کہ راحت ہو !
خزاں آئی تو پھولوں کا غرور رنگ و بو ٹوٹا

غرور حسن چکنا چور ہوتے میں نے دیکھا ہے !
"ہوا یہ اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا"

اٹھی جب تربت دل سے اک آہ شعلہ بار عاقل
تو پھر شہر خموشاں کا سکوت کاخ و کو ٹوٹا !

اسلام آباد

۳۰ مئی ۱۹۹۲ء

لہ میر تقی میر

کس کی زلفوں کی ہے سازش کہ اٹھا ہے بادل
کس کو دیکھا ہے کہ لہرا کے چلا ہے بادل

صبح سے ہے مرے آنگن میں سماں رم جھم کا
کس کی آمد ہے کہ یوں نغمہ سرا ہے بادل

بجلیاں کوند رہی ہیں سرگردوں کیا کیا
جانے کس شوخ کے چلنے کی ادا ہے بادل

کسی میخانے پہ برسے گا ضرور آج کہیں
ان کی زلفوں کی قسم کھا کے چلا ہے بادل !

ہے وہ ہیبت کہ جو دیکھیں تو لگے کوہ ابد
کیجئے محسوس تو اک موج ہوا ہے بادل

گیسوؤں سے جو نمودار ہوئی ہے اک شکل
برق چمکی ہے تو گھبرا کے اٹھا ہے بادل !

آہ دل سے جو اٹھی دود خراماں ہو کر
اشک بن کر مری آنکھوں سے بہا ہے بادل

کیا مہ و مہر کی کرنیں بھی ہیں کانٹوں کی طرح
اب جو برسا ہے تو کیا آبلہ پا ہے بادل !

شام ہے پہنے ہوئے قوس قزح کا جھومر
سر پہ دستار شفق باندھ رہا ہے بادل

نام کیا دیجئے اس ہوش ربا موسم کو
سایہ زلف طرح دار ہے یا ہے بادل !

جو گرجتے ہیں برستے ہیں کہاں وہ عاقل
چرخ پر خود ہی دھواں بن کے اڑا ہے بادل

اسلام آباد

۱۲ فروری ۱۹۹۲ء

شوق کوکب تھا میسر کہ جو اب ہے موسم
گل ہے پیانہ بکف شیشہ بلب ہے موسم

دختر رزکہ ہے منجملہ سامان بہار
شاہزادوں کے لئے بنت عنب ہے موسم

خیمہ زن ہے کبھی صحرامیں کبھی گلشن میں
برگ آوارہ کی مانند عجب ہے موسم

مے کے بادل سے چلے آتے ہیں میخانے سے
کیا قیامت ہے یہ رت کیسا غضب ہے موسم

لب تک آتے ہی گرا ہاتھ سے جام مے ناب
میرے اللہ یہ کب تھا کہ جو اب ہے موسم

پارہ پارہ ہے گریباں ہو کہ داماں یارو
لحظہ لحظہ مری وحشت کا سبب ہے موسم

میرے احساس شگفتہ کا ہے پرتو عاقل
ورنہ جیسا نظر آتا ہے وہ کب ہے موسم

اسلام آباد
۱۷ مئی ۱۹۹۲ء

دل ہے پہلو میں کہ اک برق تپاں ہے ساقی
سارا عالم مری جانب نگراں ہے ساقی

دل میں آباد ہے اک شوق کی دنیا لیکن
اب غم دہر سے فرصت ہی کہاں ہے ساقی

اہل دنیا نے وہ کی حرف وفا کی تذلیل
ذکر بھی اب تو طبیعت پہ گراں ہے ساقی

لب کشائی پہ مصر ہے دل ناکردہ گناہ !
اس میں ہر چند کہ اندیشہ جاں ہے ساقی !

تجھ سے کم تر مرا معیار طلب ہو کیوں کر !
کون تجھ سا تری محفل میں جواں ہے ساقی

ہو کے آئی ہے ترے شہر سے یوں لگتا ہے
بہکی بہکی سی نسیم گزراں ہے ساقی ! ! !

کون ہے ہم سا بلا نوش تری محفل میں !
کون آتش بہ نفس شعلہ بجاں ہے ساقی !

زیست آشوب ہے ہر جرعہ صہبا جیسے !
قلقل مینا بھی رندوں کی فغاں ہے ساقی

چشم سفاک میں ہیں یورش دل کے ساماں
تیر پلکوں کے ہیں ابرو کی کماں ہے ساقی

خط پیمانہ سہی سطح سمندر کا سکوت ! !
ایک طوفاں تہہ پیمانہ نہاں ہے ساقی ! !

ہم کہ عاقل بھی تھے دانا بھی تھے اک عمر مگر
تجھ کو دیکھا ہے تو اب ہوش کہاں ہے ساقی

اسلام آباد

۲۲ مئی ۱۹۹۲ء

کرتے ہیں دعائیں زندگی کی
کس شخص سے ہم نے دوستی کی
دل میں ہے بس اک کرن اسی کی
وہ شمع کہ جل بجھی کبھی کی

اس دل نے ہزار سرکشی کی
مانی گئی بات آپ ہی کی
شرمندہ ہیں لالہ و سمن سب
کس کس نے تری برابری کی

رہزن بھی ہیں رہزنی پہ نادم!
تم نے وہ کمال رہبری کی!
نائب تو ہے گو خدا نہیں ہے
تحقیر نہ کیجئے آدمی کی!!

دی اس نے ہمیں امانت غم
یہ بھی تو ہے بات اک خوشی کی

ہم سا بھی کوئی فقیر ہو گا ! ! !
بے تاج تھے اور شہنشہی کی
جلنے کو تو جل گیا نشیمن ! ! !
بجلی نے تو خوب روشنی کی
چٹکی جو کلی تو سب نے دیکھا !
مٹھی میں تھی زندگی کسی کی !
اترا تھا وہ چاند میرے گھر میں
چادر سی بچھی تھی چاندنی کی
کانٹوں سے گریز گل سے رغبت
توہین ہے رسم عاشقی کی !
ہم سے تو نہ ہو سکی شکایت
دریا سے بھی اپنی تشنگی کی !
تم تیرہ درون و تیرہ باطن ! !
کیا تم کو ہو قدر روشنی کی ! !

حیرت کہ تجھے خبر نہیں ہے
تجھ میں جو ادا ہے سادگی کی

میں دیکھ کے ہو گیا پریشاں
زلفوں نے جو تم سے برہمی کی !

دیکھا نہ مریضِ غم کو اٹھ کے
پرسش بھی جو کی تو سرسری کی

دل میں جو کھلے ہیں پھول سے زخم
یادیں ہیں تمہاری بے رخی کی

اب کون تجھے بتائے ظالم
اک رسم ہے بندہ پروری کی

لگتے تو نہ تھے وہ ایسے عاقل
ساحر تو نہ تھے پہ ساحری کی

اسلام آباد
۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء

یہ کس بلا کا اثر حسن بے پناہ میں ہے
شکست شیشہ دل ضرب یک نگاہ میں ہے
تو اپنے جبر پہ قائم تو رہ مگر مت بھول
کہ شق ہو سینہ گردوں وہ زور آہ میں ہے
پرے حدود ملائک سے ہے مری پرواز
سجا ہوا پر عنقا مری کلاہ میں ہے
ہمیشہ سینہ ظلمت سے پھوٹتی ہے کرن
طلوع صبح کا امکاں شب سیاہ میں ہے
وہ کہکشاں ہے جو ٹوٹا تھا نجم آخر شب
خبر نہیں کہ وہ منزل پہ ہے کہ راہ میں ہے
کہ دل کو ہوتی ہے رہ دل سے آزما تو سہی
ترے قرار کی منزل دل تباہ میں ہے

ہے انقلاب ہر اک نقطہ عروج کے بعد
زوال شب کا اشارہ فروغ ماہ میں ہے
یہ دل کہ مملکت عشق ہے یہاں عاقل
فروتنی و گدائی مزاج شاہ میں ہے

اسلام آباد
۱۳ اگست ۱۹۹۲ء

اجنبی سے لگتے ہیں بات بھی نہیں ہوتی
دل میں ہے جو طغیانی کم کبھی نہیں ہوتی

یہ ہماری نظروں کے حسن کا کرشمہ ہے
ورنہ لالہ و گل میں دلکشی نہیں ہوتی

ہوش جن کے اڑتے ہیں کچھ وہی بتائیں گے
ہم تو جب بھی پیتے ہیں بے خودی نہیں ہوتی

جو دیئے بجھا کر بھی دل جلائے رکھتے ہیں
گھر میں ایسے لوگوں کے تیرگی نہیں ہوتی

جس کو دیکھو پھرتا ہے وصل کی تمنا میں
اس میں جان جاتی ہے دل لگی نہیں ہوتی

ایک بار پھر بھی وہ مسکرا تو دیں لیکن
آرزو کوئی دل کی آخری نہیں ہوتی

ہنس دیئے جو کھائے زخم رو دیئے جو دل ٹوٹا
ہم نے لاکھ کوشش کی دشمنی نہیں ہوتی

کم نگاہ کیا جانیں یہ ہیں پیار کی باتیں
بے رخی سی لگتی ہے بے رخی نہیں ہوتی

اک ابھرتے سورج کی آرزو کرو یارو!
ڈوبتے ستاروں میں روشنی نہیں ہوتی

گرم و سرد دنیا سے چل رہے ہو بچ بچ کر
اس طرح زمانے سے آگہی نہیں ہوتی

بندگان حق کا بھی کچھ تو فرض ہے تم پر
صرف زہد و تقویٰ سے بندگی نہیں ہوتی

آپ مسکرائیں تو ہم کو آزمائیں تو
جان اک تبسم سے قیمتی نہیں ہوتی

فن ہے اک خوشامد بھی جو تمہیں نہیں آتا
اس طرح تو اے عاقل نوکری نہیں ہوتی

اسلام آباد

۳۱ اگست ۱۹۹۲ء

محبت کے تقاضے بے رخی سے کم نہیں ہوتے
وہ برہم ہو کے بھی ہم سے کبھی برہم نہیں ہوتے

تصور کو مرے آ کر وہ پہروں جگمگاتے ہیں
دیئے یادوں کے جلتے ہیں تو پھر مدھم نہیں ہوتے

عجب اک بے سروپا سی حقیقت ہے محبت بھی
کسی صورت کسی حالت یہ شکوے کم نہیں ہوتے

جو ہم بچھڑے تو روئے اور ملے تو دل امڈ آیا
کوئی موسم ہو ان آنکھوں میں آنسو کم نہیں ہوتے

یہ کیسی آدمیت ہے کہ آدم صید آدم ہے
وہ انساں کیا کہ انساں کے شریک غم نہیں ہوتے

تم اپنے جبر سے اہل وفا کو کیا ڈراتے ہو !
یہ وہ سر ہیں کہ کٹ جاتے ہیں لیکن خم نہیں ہوتے

جو ان آنکھوں کے جادو سے نہیں واقف وہ بدقسمت
شناسائے مزاج شعلہ و شبنم نہیں ہوتے

مجھے ان کی توجہ میں کمی محسوس ہوتی ہے
ستم ہوتے تو ہیں اب بھی مگر پیہم نہیں ہوتے
اگرچہ دل میں ہے اک کرب کا محشر بپا عاقل
ہمارے دیدہ ہائے شوق پھر بھی نم نہیں ہوتے

اسلام آباد

۱۰ ستمبر ۱۹۹۲ء

یک جا گل و خار کر رہا ہوں
تہذیب بہار کر رہا ہوں

آہستہ خرام اے جوانی
کچھ قول و قرار کر رہا ہوں

لے موج نسیم کوئے جاناں
میں دل کو غبار کر رہا ہوں

تفسیر بہار ہو رہی ہے
توصیف نگار کر رہا ہوں !

تڑپا ہے شکست حسن پر دل !
میں عشق پہ وار کر رہا ہوں

وحشت سے نہیں ہے چاک دامن
تکریم بہار کر رہا ہوں !

ان اجلے دنوں کی ساری یادیں
وقف شب تار کر رہا ہوں !

آنسو جو بچے غم جہاں سے
نذر غم یار کر رہا ہوں

خود ہی کو نہیں ستم زدوں میں
تجھ کو بھی شمار کر رہا ہوں

پایاب کہیں نہ ہو کے رہ جائے
دریا کو میں پار کر رہا ہوں !!

گل رنگ ، چراغ کاسہ سر
روشن سر دار کر رہا ہوں

بھٹکا تھا جو بیشہ گماں سے
وہ شیر شکار کر رہا ہوں

باقی ہیں جو چند سانس تجھ پر
میں وہ بھی نثار کر رہا ہوں

افکار کی خوشبوؤں کو عاقل
لفظوں سے حصار کر رہا ہوں

اسلام آباد
۱۹ ستمبر ۱۹۹۲ء

اس دل کو بار بار جو بہلا رہے ہیں آپ
کیا سچ ہے یہ کہ میرے قریب آ رہے ہیں

ایسا نہ ہو کہ مر ہی نہ جاؤں خوشی سے میں
یہ کیا کہ میری جاں کی قسم کھا رہے ہیں آپ

پرسش کے چند حرف تکلف سہی مگر
یہ زحمت کلام جو فرما رہے ہیں آپ

تھا خواب یا خیال مگر چشم شوق نے !
دیکھا کہ میری سمت کھنچے آ رہے ہیں آپ

ویسے بھی ہم کو جان سے جانا تھا ایک دن
ناحق ذرا سی بات پہ پچھتا رہے ہیں آپ

اب کون اس کو مانے گا افسانہ آپ کا
میری ہی داستاں ہے جو دہرا رہے ہیں آپ

اس دل کا ٹوٹنا تو کوئی حادثہ نہیں
کیوں اس قدر ملول نظر آ رہے ہیں آپ

لگتا ہے اس جہان عریض و بسیط پر
برکھا کے بادلوں کی طرح چھا رہے ہیں آپ
پھر درد لا دوا نے پکارا ہے آپ کو !
صرف اس لئے کہ میرے مسیحا رہے ہیں آپ
عاقل کچھ اور آپ کے غم کا نہیں سبب
بس جرم آگہی کی سزا پا رہے ہیں آپ

اسلام آباد
۲۲ اپریل ۱۹۹۲ء

سکھ جنگلوں میں دکھ کا مداوا بنوں میں تھا
جب تک کہ تیرے شہر میں تھا الجھنوں میں تھا

دیکھا تو ہوتا کر کے شریک الم مجھے !
حل تیری مشکلوں کا مرے ناخنوں میں تھا

روشن کیا ہے دل بھی مرے غمکدے کے ساتھ
اترا وہ چاند یوں تو سبھی آنگنوں میں تھا

حسرت رہی کہ تجھ کو نظر بھر کے دیکھتے
کیسا حجاب تھا کہ ترے درشنوں میں تھا

وہ دوستی رہی کہ گماں تک نہ ہو سکا
کس درجہ رکھ رکھاؤ مرے دشمنوں میں تھا

الزام صرف عقل پہ رکھنا نہ تھا درست !
دل کا شمار بھی تو مرے رہزنوں میں تھا

اک اہتمام بزم نگاراں تھا اس طرف
باران نور کا سماں چلمنوں میں تھا
عاقل ملے جب ان سے تو یہ بھید بھی کھلا
سب حال قسمتوں کا لکھا چتونوں میں تھا

اسلام آباد
۱۹ جولائی ۱۹۹۲ء

اگر کہنا ہے حال دل تو بے رد و بدل کہئے
غزل کہئے تو پھر برجستہ کہئے بر محل کہئے

لطافت ہو نزاکت ہو اگر لفظ و معانی میں
تو پھر اس امتزاج نور و نکہت کو غزل کہئے

یہی وہ غم ہے جو دنیا کی سب خوشیوں پہ بھاری ہے
اسی اک غم کو ساری زندگی کا ماحصل کہئے

مرے احساس کی پرچھائیاں ہیں لالہ و گل میں
بہاروں کو مرے جذبات کا رد عمل کہئے

یہ کس کے حسن دلکش کی ہیں تصویریں گلستاں میں
حجاب چشم کو نرگس تبسم کو کنول کہئے

تری انگڑائی کا قوس قزح اک استعارہ ہے
کہ جیسے کہکشاں کو تیری پیشانی کا بل کہئے

مشیت ہے یہی تو رنج و راحت کیوں برابر ہوں
اسی انداز سے ہوتی ہے تقسیم ازل کہئے

جناب شیخ کیوں ہر روز آ جاتے ہیں رندوں میں
کہ اس سے شغل مے نوشی میں پڑتا ہے خلل کہئے
یہ مانا ان کی آنکھوں کا سہارا کم نہیں عاقل
مگر پھر بھی نہ غم ہائے جہاں کو بے محل کہئے

اسلام آباد

۱۸ جون ۱۹۹۲ء

گر ہم نگار وقت کی زلفیں سنوارتے
بازی جو ہم نے جیت کے ہاری نہ ہارتے

سنتا بھی کون تیرے سوا دل کی دھڑکنیں
اب ہم پکارتے بھی تو کس کو پکارتے

ملتا ہمیں جو اذن تماشائے یک نظر
تصویر ہو بہو تری دل میں اتارتے

دامن سے اپنے دور نہ تھا گوہر مراد
ہم دل تو ہار بیٹھے تھے ہمت نہ ہارتے

دیکھا تو ہوتا ہم کو محبت سے ایک بار
پھر ساری زندگی ترے در پر گزارتے

جب تک نہ جانتے کہ مجھے کس کی ہے تلاش
طفلان شہر یوں مجھے پتھر نہ مارتے

اپنی انا سے ہم نے اسے پا کے کھو دیا !
اہل ہوس تو ورنہ کئی روپ دھارتے
عاقل انہیں تو تجھ سے محبت تھی اس قدر
تجھ پر تو تیرے سر کی قسم جاں بھی وارتے

اسلام آباد
٦ اگست ١٩٩٢ء

یہ درد ہے تو جان کا سودا ہی کیوں نہ ہو
ہم کو نہیں قبول مداوا ہی کیوں نہ ہو

آنسو چھلک بھی جائے تو گوہر سے کم نہیں
ہر چند ضبط غم کا تقاضا ہی کیوں نہ ہو

ہے بندگی ہر ایک تکلف سے بے نیاز
کعبہ ہی کیوں نہ ہو وہ کلیسا ہی کیوں نہ ہو

ہم نے کیا ہے فیصلہ ترک تمام کا
اے دوست اب وہ تیری تمنا ہی کیوں نہ ہو

جاں ہے تو تیرے غم کو کریں کیوں نہ حرز جاں
دل ہے تو پھر یہ عشق میں رسوا ہی کیوں نہ ہو

مٹ جائے جو بھی ساجد و مسجود میں ہے فرق
نقش جبیں بھی نقش کف پا ہی کیوں نہ ہو

شوریدگی سرشت ہے دریا کی اور بس
ڈوبا ہوا کوئی سر دریا ہی کیوں نہ ہو

یوں میکدے سے ہم کو اٹھانا نہیں درست
کچھ تو عطا ہو زہر کا پیالہ ہی کیوں نہ ہو

عاقل خدا کا شکر کہ ہر حال میں ہیں خوش
ہم سے کسی کو رنجش بے جا ہی کیوں نہ ہو

اسلام آباد
۱۰ فروری ۱۹۹۲ء

رہرو ہو یا کہ رہبر کامل سفر میں ہے
جو شخص بھی سفر کے ہے قابل سفر میں ہے
اک دائرے کے گرد ہیں گردش میں روز و شب
منزل سفر میں جادہ منزل سفر میں ہے
جولاں گہہ جنوں ہیں تصور کی وسعتیں
دل ہے اگرچہ رہن سلاسل سفر میں ہے
ساحل گریز اہل سفینہ کو کیا خبر
موجوں کے ساتھ ساتھ ہی ساحل سفر میں ہے
صحرا میں اڑ رہے ہیں بگولے کچھ اس طرح
بے ناقہ ہو بہو کوئی محمل سفر میں ہے
یادیں ہیں ساتھ یادوں کی رعنائیاں بھی ہیں
محفل کے ساتھ رونق محفل سفر میں ہے

منزل کے بھید اڑتی صداؤں سے پوچھئے
دوش ہوا پہ شور عنادل سفر میں ہے
سعدی کی زندگی سے ملا ہے ہمیں سبق
عاقل تمام زیست کا حاصل سفر میں ہے

اسلام آباد
۱۰ اگست ۱۹۹۲ء

عہد شباب و شوق کی ساری لوائیں بھول جا
اپنی وفائیں بھول جا ان کی جفائیں بھول جا
تیرا ستم بھی ہے کرم کیسی تلافی ستم
میرے خلوص کی قسم اپنی خطائیں بھول جا
رات گذر گئی تو کیا دن بھی گزر ہی جائے گا
ہو نہ ہو عشق پر کرم آئیں نہ آئیں بھول جا
تیرے سلوک سے کھلا جنس حقیر ہے وفا
میں نے کبھی جو دیں تجھے دل سے دعائیں بھول جا
اب وہ محبتیں ہوئیں بھولی ہوئی کہانیاں
تو انہیں شوق سے بلائے اور وہ آئیں بھول جا
فتنے نہ سر اٹھائیں پھر حشر نہ جاگ اٹھے کہیں
ان کے خرام نازکی لے کے بلائیں بھول جا
عاقل زار کیوں تجھے زعم سخن سرائی ہے
محفلیں وہ اگر تجھے یاد بھی آئیں بھول جا

اسلام آباد
۴ جنوری ۱۹۹۲ء

ہر شخص ہی دل دینے کو تیار لگے ہے
تیری تو گلی مصر کا بازار لگے ہے
تم دیکھنا اک روز سنور کر تو وہ دیکھے
پھر کیسا مرا یار طرح دار لگے ہے
ابرو سے تری لرزے ہے ہر لحظہ دل زار
تو آنکھ اٹھاوے ہے تو تلوار لگے ہے
کچھ ایسا لگے ہے کہ خفا ہم سے ہے جاناں
اقرار بھی ظالم ترا انکار لگے ہے!
کس شخص سے فریاد کریں کس کو پکاریں
ہے جو بھی یہاں تیرا طرفدار لگے ہے
ہم سے ہے وہ شرمندہ جفاؤں پہ ہے نادم
اپنی تو ہمیں جیت بھی اب ہار لگے ہے

معلوم نہیں کب سے ہیں گردش میں مہ و سال
انسان فقط نقطہ پرکار لگے ہے!
مژگاں پہ نہیں بوند مرے خون جگر کی
یارو کوئی منصور سر دار لگے ہے
باقی ہیں سبھی کام کہ جو کرنے تھے عاقل
اور تیز بہت وقت کی رفتار لگے ہے

اسلام آباد
۱۷ اگست ۱۹۹۲ء

جمال دوست کے کچھ راز یوں بھی فاش ہوئے
نظر اٹھائی تو آئینے پاش پاش ہوئے

چنا تھا پلکوں سے ہم نے جنہیں وہی کانٹے
بہار آئی تو پیکان گل تراش ہوئے

یہ جستجو کا قرینہ بھی ہر کسی میں نہیں
کہ اپنے آپ کو کھویا تو وہ تلاش ہوئے

ہم اس طرح ترے عہد ستم سے گزرے ہیں
جگر بھی ٹکڑے ہوئے دل بھی قاش قاش ہوئے

ثقافت و ادب و شعر کا تھا حق جن پر
وہ دن حیات کے صرف غم معاش ہوئے

ہمیں سے بیر فلک کو ہوا تو کیوں عاقل
اگرچہ اور بھی محروم بود و باش ہوئے

اسلام آباد

۲۶ جون ۱۹۹۲ء

پہلو بھی اس نظر کو بدلنے نہیں دیا
ہم نے حریف دل کو سنبھلنے نہیں دیا

تھی مختصر جو وصل کی شب ہم نے دوستو
مشرق سے آفتاب نکلنے نہیں دیا

ان کے تمام وار انہیں پر پلٹ دیئے
اک تیر بھی کمان سے چلنے نہیں دیا

جھیلیں ان انکھڑیوں کی بھی ویران ہو گئیں
پیغام کوئی بجھتے کنول نے نہیں دیا

دل خون ہو کے میری مژہ پر تو جم گیا
وارفتگی میں حد سے نکلنے سے دیا

اس درجہ تیرے غم کی امانت کا پاس تھا
یادوں کو آنسوؤں میں بھی ڈھلنے نہیں دیا

سینچا تھا خون دل سے جو اک نخل آرزو
اس کو خزاں نے پھولنے پھلنے نہیں دیا
تھی کون سی جہت کہ عطا کی نہ ذہن کو
لہجہ تھا کون سا کہ غزل نے نہیں دیا

اسلام آباد
۲۵ ستمبر ۱۹۹۲ء

یہ میرے دامن شب میں ہے کون خواب نما
طلوع صبح کی مانند آفتاب نما
کسی بھی گل میں ہے اس کی شگفتگی نہ مہک
چمن میں گل تو کھلے ہیں بہت گلاب نما
مجھے لگا ہے کہ دیکھے ہیں میں‌نے کھلتے کنول
کہ ان کی آنکھوں میں اک جھیل سی ہے خواب نما
وہ شعلہ رنگ بھی ہے اور نور و نکہت بھی
کہ لب شرار ہیں رخسار ہیں شہاب نما
یہ کیا کہ تجھ کو نظر بھر کے دیکھ بھی نہ سکے
نقاب تھا کہ نہ تھا کچھ تو تھا نقاب نما
یہ کون ہے جو شبستان دل میں آیا ہے
سراپا کاہکشاں چہرہ ماہتاب نما
تمام عمر پڑھوں بھی تو پڑھ نہیں سکتا
بسی ہے دل میں جو اک صورت کتاب نما

ہو کچھ تو پاس روایات میکدہ ساقی
نہیں شراب تو پھر کچھ تو دے شراب نما

رمق سی تھی جو ہوا میں مٹا گئی ہم کو
ہماری ہستی موہوم تھی حباب نما

برس پڑے نہ کہیں میری چشم نم عاقل
وہ زلف پھر مرے بازو پہ ہے سحاب نما

اسلام آباد
۲۹ ستمبر ۱۹۹۲ء

بس اک گھٹن ہے ہوا کی کوئی رمق بھی نہیں
کہ جیسے اب ہمیں جینے کا کوئی حق بھی نہیں

اک ہم کہ مانگ رہے ہیں دعائیں ملنے کی
اک آپ ہیں کہ بچھڑنے کا کچھ قلق بھی نہیں

میں اب کروں تو کہاں خونِ دل تلاش کروں
جو تھی کبھی تری آنکھوں میں وہ شفق بھی نہیں

فریب کھا کے گزاری تمام عمر مگر
ہمارے دامنِ عبرت میں اک سبق بھی نہیں

وہ آئیں گے تو چمن کی فضا بدل دیں گے
ابھی تو لالہ و نسریں کا رنگ فق بھی نہیں

بہار کلیوں کی مٹھی میں بند ہے عاقل
ابھی چمن میں کوئی گل ورق ورق بھی نہیں

اسلام آباد
۱۲ اکتوبر ۱۹۹۲ء

دہر کے آشوب آب و گل میں ڈھل جانے کا نام
زیست ہے نوک سناں پر رقص فرمانے کا نام
تشنگی مغلوب احساس خودی ہو کر رہی
آتے آتے رہ گیا ہونٹوں پہ پیمانے کا نام
ان کی زلفیں ہیں گھٹائیں ان کی آنکھیں میکدہ
ان کا انداز تبسم برق لہرانے کا نام
اس قدر احساس تو ساقی کو ہونا چاہئے
نام سے رندوں کے وابستہ ہے میخانے کا نام
موت ہے آغوش طوفاں میں اگر اے دوستو
زندگی بھی تو نہیں ہے پار اتر جانے کا نام
اب یہ موجیں ہی بتائیں گی کہ تھا وہ کون شخص
ریگ ساحل پر لکھا ہے ایک دیوانے کا نام

عشق کی عظمت کا اندازہ ذرا اے اہل بزم
شمع کب کی جل بجھی روشن ہے پروانے کا نام
وہ تو سب کے دل میں ہیں انکے تو ہیں عنواں بہت
ایک ہی لیکن ہے عاقل اپنے افسانے کا نام

اسلام آباد
۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ء

وہ چشمِ ناز جو موضوعِ گفتگو ٹھہرے
چھلک اٹھیں خم و مینا نہ پھر سبو ٹھہرے
وہ سرو ہو کہ سمن برگ لالہ ہو کہ گلاب
چمن میں کون ہے جو تیرے روبرو ٹھہرے
دکھائیں تجھ کو لگائے ہیں کارواں نے جو زخم
کہیں جو بہرِ ملاقات ہم سے تو ٹھہرے
لہو سے اپنے جلا کر چراغِ لالہ و گل
بلا کشانِ محبت ہی سرخرو ٹھہرے
کچھ اس طرح سے ادا کی نمازِ عشق کہ ہم
حضورِ یار وہ روئے کہ با وضو ٹھہرے
جو سچ ہے جرم تو ہم کو ہے اعتراف اس کا
بجا کہ شہر میں اک ہم ہی تند خو ٹھہرے
اس ایک کوششِ بے سود میں کٹی سب عمر
کبھی تو لب پہ مرے حرفِ آرزو ٹھہرے

ابھی وہ آئے ہیں ٹھہرے ابھی نسیم بہار
اڑ رہا ہے جو یہ سیل رنگ و بو ٹھہرے

میں گمرہی کا تصور کروں تو کیسے کروں
تری تلاش ہی جب شرط جستجو ٹھہرے

میں دوش دوں تو کسے بے وفائی کا عاقل
جو اپنے دوست تھے کل تک وہی عدو ٹھہرے

اسلام آباد
اگست ۱۹۹۱ء

یہ کون جام تہی کردہ انجمن سے اٹھا
ستارہ چرخ سے ٹوٹا شرر کرن سے اٹھا

بسا گیا ہے فضاؤں میں ہر طرف خوشبو
ہوا کا جھونکا جو چھو کر ترے بدن سے اٹھا

یہ کس کی پلکوں پہ آ کر ٹھہر گیا آنسو !
ستارہ سحری رات کے کفن سے اٹھا

سواد گل سے جو گذری کبھی نسیم سحر
بلا کا شور ہر اک گوشہ چمن سے اٹھا

کرن کرن میں ہے اس کی قبا کی رنگینی
خمیر شمس و قمر تار پیرہن سے اٹھا

اٹھا جو سرو سے وہ حشر بن گیا قامت
اب اور فتنہ کوئی سنبل و سمن سے اٹھا

یہ کیا کہ دل میں کوئی آرزو نہ شوق وصال
عروس گل کی سواری تو بانکپن سے اٹھا
دوئی پرست نہیں ہے خدا سرشت ہے تو
جو ہو سکے تو یہ پردہ بھی اہرمن سے اٹھا
نہ جانے کب سے جنوں محو خواب تھا عاقل
غزل سرا مرے گہوارہ سخن سے اٹھا

اسلام آباد
۶ دسمبر ۱۹۹۱ء

حجاب جتنے تھے سارے اٹھا گیا کوئی
مجھی سے میرا تعارف کرا گیا کوئی
کچھ آئینے سے بنے تھے جو بن کے ٹوٹ گئے
میں خواب دیکھ رہا تھا جگا گیا کوئی
مرے شعور کو لے کر گرفت میں اپنی
مرے حواس پہ پہرے بٹھا گیا کوئی
ہوائے دامن قربت سے اڑ گئے سب ہوش
چراغ خود ہی جلا کر بجھا گیا کوئی
اسی کے صدقے کھلے ہیں دل حزیں میں گلاب
وہ ایک زخم جو ہنس کر لگا گیا کوئی
تو کیا ہوا جو بجھا ڈالے حسرتوں کے چراغ
حریم جاں میں تو شمعیں جلا گیا کوئی
تمام رات دمکتے رہے نجوم و قمر
سحاب نور بنا اور چھا گیا کوئی

بسی ہیں اس میں سبھی کیفیات وصل و فراق
جو درد پہلو سے اٹھ کر اٹھا گیا کوئی

وفا ہے یہ کہ وفا کا صلہ نہیں معلوم
یہ جان بوجھ کے کیوں مات کھا گیا کوئی

گئے دنوں کو بھلا تو دیا تھا ہم نے مگر
پھر آج ٹوٹ کے کیوں یاد آ گیا کوئی

دل و دماغ مہکتے ہیں آج تک عاقل
یہ ایک خوشبو سی کیسی بسا گیا کوئی

اسلام آباد
اگست ۱۹۹۱ء

ہلچل ہو قیدیوں میں تو زنجیر کھینچئے
یعنی زمام زلف گرہ گیر کھینچئے

یہ کون ہے جو آتا ہے کانٹوں کے درمیاں
اس پا برہنہ شخص کی تصویر کھینچئے

جرأت ہے شرط عرض تمنا کے واسطے
دست دعا سے دامن تاثیر کھینچئے

ابرو کی ایک جنبش موہوم ہی سہی
یوں بھی ذرا میان سے شمشیر کھینچئے

پہلے ہی لوگ فرط الم سے نڈھال ہیں
اب اور اپنی سمت نہ زنجیر کھینچئے

ایسا نہ ہو کہ ہاتھ سے پتوار چھوٹ جائے
طوفان کی ابھی سے نہ تصویر کھینچئے

عاقل کشید کیجئے ذروں سے آفتاب
ظلمت سے نور سائے سے تنویر کھینچئے

اسلام آباد
۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء

دیکھا جو چاہتوں کے خریدار آ گئے
ہم لے کے جنس دل سر بازار آ گئے

کیوں واعظوں سے الجھے ہیں رندان میکدہ
کن پارساؤں میں یہ گنہ گار آ گئے

تم کو بھی اے بتان کم آمیز و کم سخن
انداز ہائے شوخئی گفتار آ گئے

کوندیں وہ بجلیاں سر ہر بام و در کہ ہم
گھبرا کے زیر سایہ دیوار آ گئے

قاتل کو ہم نے زحمت یک گام تک نہ دی
ہم اہل درد خود ہی سر دار آ گئے

اچھا ہوا کہ تم کو دم نزع ہی سہی
آداب دل نوازی بیمار آ گئے
عاقل میں ان سے جاں کی اماں مانگتا بھی کیا
وہ خود ہی لے کے ہاتھ میں تلوار آ گئے

(لاہور اور کراچی کے درمیان ہوائی سفر کے دوران)

۲۲ دسمبر ۱۹۹۱ء

لمحے کبھی جو وصل کے یاد آئے ہیں بہت !
قصے تری وفاؤں کے دہرائے ہیں بہت !

گھیرا ہے جب ہجوم خیالات نے تو ہم
تنہائیوں میں رات کی گھبرائے ہیں بہت

کرنے کو کر چکے ہیں وہ ترک تعلقات
لیکن سنا ہے بعد میں پچھتائے ہیں بہت

دیکھا کیئے ہمیں وہ کنکھیوں سے بار بار
ہم نے نظر ملائی تو شرمائے ہیں بہت

رستہ کٹھن ہے اور کڑی دھوپ ہے تو کیا
ان گیسوؤں کے نرم و خنک سائے ہیں بہت

پھوٹی ہیں کونپلیں بھی شگوفے بھی ہیں کھلے
کچھ گل مگر بہار میں کملائے ہیں بہت

کی ہے کبھی جو ہم نے تمنا بہار کی
سائے خزاں کے اور بھی لہرائے ہیں بہت

عاقل حوادث غم دوراں بھی کم نہ تھے
دانستہ بھی فریب مگر کھائے ہیں بہت

اسلام آباد
۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء

قدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے اک شخص
مت پوچھئے کیا ہے گل و گلزار ہے اک شخص

ہے کتنا حسیں میرے تخیل کا خزینہ
یعنی مرا سرمایہ افکار ہے اک شخص

ہے دل کے لئے جنت احساس وہ اک شکل
آنکھوں کے لئے شعلہ دیدار ہے اک شخص

وہ تیر نظر میں ہے کہ پیوست ہے دل میں
وہ کاٹ ہے آنکھوں میں کہ تلوار ہے اک شخص

آئینہ سر بزم عدو دیکھا ہے جب سے
خود اپنی محبت میں گرفتار ہے اک شخص

یا میری طلب میرا مقدر نہیں عاقل
یا حرف نوشتہ سر دیوار ہے اک شخص

اسلام آباد
۱۷ دسمبر ۱۹۹۱ء

آنکھوں سے تری یوں تو سبھی مست ہوئے ہیں
کچھ تیر بھی دل میں مرے پیوست ہوئے ہیں

صدیوں کا سفر اور نہ نشان رہ و منزل
وامانده میان عدم و ہست ہوئے ہیں

ہر سمت ہے اک آتش نمرود تو کیا غم
طے مرحلہ عشق بیک جست ہوئے ہیں

ایسے بھی ہیں درویش خدا مست جہاں میں
شاہوں سے بھی بڑھ کر جو زبردست ہوئے ہیں

اللہ نے دی ہے جنہیں ہمت کی بلندی
ایسوں کے ارادے بھی کبھی پست ہوئے ہیں

قدموں میں انہیں کے تو ہے کونین کی دولت
جو لوگ کہ ظاہر میں تہی دست ہوئے ہیں

تھی مجھ پہ اچانک جو توجہ تو عجب کیا
برگشتہ و برہم بھی تو یک لخت ہوئے ہیں

کیا جانئے کس چشم محبت کا ہے افسوں
ہم مست تھے اب اور بھی بدمست ہوئے ہیں

ہندو تھے مگر شانہ کش گیسوئے اردو
سرشارو دیا شنکر و چکبست ہوئے ہیں

اس تازہ غزل کے لئے آورد کا عنواں
الفاظ و معانی کے دروبست ہوئے ہیں

ٹوٹے ہیں سپہر غم ہستی سے جو انجم
عاقل وہ نگیں شعر میں پیوست ہوئے ہیں

اسلام آباد

۱۵ جون ۱۹۸۶ء

فصل گل آئی ہے اب کے عجب انداز کے ساتھ
ایک ہی نغمہ جاں سوز ہے ہر ساز کے ساتھ

کچھ تو ارشاد ہو اے محو تماشائے بہار
خود بکھر جائیں گے نغمے تری آواز کے ساتھ

خامشی میں بھی تکلم کی ادا ہو جیسے !!!
لاکھ پہلو ہیں سخن کے لب اعجاز کے ساتھ

اب ہے ان کا کوئی غم خوار نہ مونس نہ رفیق
تھے جو وابستہ تری جلوہ گہہ ناز کے ساتھ

وہ تری پہلی نظر تھی کہ قیامت اے دوست
لوگ انجام کو پہنچے ترے آغاز کے ساتھ

ہے نظام دل و جاں آج بھی برہم برہم
اس نے دیکھا تھا نگاہ غلط انداز کے ساتھ

یہ سماعت کا ہے افسوں کہ محبت کا طلسم
دل پگھلتے ہیں تری گرمیِ آواز کے ساتھ

محوِ پرواز ہے شاہینِ تخیل عاقل
رقص میں صیدِ معانی بھی ہے شہباز کے ساتھ

کراچی
۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء

دل وجد میں ہے رقص سردار کی طرح
خاموشیٔ جنوں بھی ہے گفتار کی طرح

اک روشنی سی پھیل گئی کائنات میں
وہ مسکرائے مطلع انوار کی طرح

فرقت کی شب کٹی تو ملی وصل کی نوید
رنگ سحر تھا عکس رخ یار کی طرح

راتوں کو جاگتے رہے اف رے تخیلات
ہم خفتہ بخت دیدہ بیدار کی طرح

پہنچے تو تیرے شہر کا موسم عجب ملا
چلتی تھی باد صبح بھی تلوار کی طرح

بیٹھے ہیں وہ لئے ہوئے آنکھوں میں آفتاب
سمٹے ہوئے ہیں سایہ دیوار کی طرح

ہم بھی رہے نگار بہاراں سے ہم نگاہ
لیکن سکوت نرگس بیمار کی طرح

حالات کے افق سے عیاں ہیں تغیرات
اے دوستو نوشتہ دیوار کی طرح

اپنے سر جنوں کا غرور خموش ہیں
پازیب کی طرح ہیں نہ جھنکار کی طرح

آیا ہے پھر کوئی سر بالین انتظار
آنکھیں اٹھی ہیں ابر گہر بار کی طرح

عاقل یہ دور جنس معانی سے ہے تہی
صورت فروش مصر کے بازار کی طرح

خیرپور
۳۰ جنوری ۱۹۶۹ء

اک نشئہ ے موج ہوا مانگ رہی ہے
تجھ سے تری خوشبوئے قبا مانگ رہی ہے

حیراں ہیں سبھی غنچہ و گل صحن چمن میں
کیا جانئے کیا باد صبا مانگ رہی ہے

اے دوست تری یاد سے مخمور اک آواز
نغموں سے ترنم کی ادا مانگ رہی ہے

ہر جرعہ کش غم سے سر میکدہ عشق
دوشیزہ ے لغزش پا مانگ رہی ہے

نرگس نے کہا ہے یہ پپیہے کی زباں میں
مستی تیری آنکھوں سے ہوا مانگ رہی ہے

ایک ایک نفس کو تری پاکیزہ محبت
شائستہ آداب وفا مانگ رہی ہے

اک بار تو اے ابر گہر بار برس جا
پیاسی ہے بہت خلق دعا مانگ رہی ہے

جو عشق کی حرمت ہے اسی عہد کی تجدید
پھر عظمت خون شہداء مانگ رہی ہے

تاریخ پھر اس دور ستم کیش میں یارو
اک معرکہ کرب و بلا مانگ رہی ہے

تزئین گلستاں کو بہار گل و لالہ
ہاتھوں سے ترے رنگ حنا مانگ رہی ہے

گھبرائی ہوئی سی ہے نسیم گزراں آج
مجھ سے ترے کوچہ کا پتہ مانگ رہی ہے

اک جان ہی باقی ہے سو اسے حسن جفا ساز
وہ بھی تیری شوخی کی ادا مانگ رہی ہے

اللہ نے دی ہے جو مجھے درد کی دولت
ہمت مری اس سے بھی سوا مانگ رہی ہے

روشن ہو جو آ جائے وہ مہتاب تمنا
وہ رات جو تاروں سے ضیاء مانگ رہی ہے

اس کے لب و عارض کی ثناء کیجئے عاقل
مضمون حسیں فکر رسا مانگ رہی ہے

خیرپور
۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء

بادلوں کو زلف زلفوں کو گھٹا کہنے کو ہیں
ہم نشے میں ہیں نہ جانے اور کیا کہنے کو ہیں

ہم ستم کو بھی اک انداز وفا کہنے کو ہیں
اب وہ عالم ہے کہ ہر بت کو خدا کہنے کو ہیں

وہ حجاب شوق کا عالم ہو یا نیرنگ حسن
ہم ترے چہرے کی سرخی کو حیا کہنے کو ہیں

اس اچانک التفات خاص کو اے دوست ہم
اک تیرے بے ساختہ پن کی ادا کہنے کو ہیں

روبروئے یار آخر کیوں زباں کھلتی نہیں
ہم تمنائے دلی سے حد سے سوا کہنے کو ہیں

دیکھنا اس میں کسی کا خون دل شامل نہ ہو
جس کو کچھ گل پیرہن رنگ حنا کہنے کو ہیں

ایک تشبیہ بلا ہے جس کو کہیئے قد یار
اک قیامت ہے جسے رفتار پا کہنے کو ہیں

دید کی خواہش ہے عاقل اور نگاہیں منفعل
دل دھڑکتا ہے کہ دل کا مدعا کہنے کو ہیں

خیرپور
۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

جو کبھی گلزار تھے وہ دل بھی ویرانے ہوئے
اب کہاں وہ لوگ اپنے جانے پہچانے ہوئے

اس کو اعجاز جنوں کہیئے کہ افسون خرد
اک غم دل سے مرتب لاکھ افسانے ہوئے

اس نگاہ پے بہ پے کی بے پناہی الاماں
ہوش بھی آنے نہ پائے تھے کہ دیوانے ہوئے

بے نیازی کی ادا بھی دلربائی میں رہی
خود ہی دل کے چور کیسے کیسے انجانے ہوئے

وہ نظر اپنی جگہ محجوب ہو کر رہ گئی
جب سر محفل نثار شمع پروانے ہوئے

سب تیرے حسن تغیر کیش کے مظہر بنے
وہ ترے کعبے ہوئے یا تیرے بت خانے ہوئے

ساقیا اس دور کم ظرفی میں کوئی کیا پیے
لے چلے میخوار خالی تیرے میخانے ہوئے

ابر نیساں سے ہماری مے کشی کا پردہ دار
آسماں ہے اک ردائے نیلگوں تانے ہوئے

بجلیوں تک سے لیا ہے ہم نے گلشن میں خراج
تھے نشیمن برق کے جو اپنے کاشانے ہوئے

رات عاقل ہم نے میخانے کا دیکھا ہے یہ رنگ
آنکھ سے چھلکی تھی اور لبریز پیمانے ہوئے

خیرپور
اکتوبر ۱۹۶۸ء

ہر چند ہے درد لا دوا بھی
ہے ضبط کی کوئی انتہا بھی
اک وہم ہے ہست و بود عالم
اک راز فنا بھی ہے بقا بھی

احساس میں نغمگی نہ ڈھونڈو
ہوتا ہے یہ ساز بے صدا بھی
مفقود ہے لطف زندگانی !
ہونے کو جفا بھی ہے وفا بھی

دل کو نہ دیا سنبھلنے اک پل
آف تھی وہ چشم سرمہ سا بھی
ہارا ہے کبھی بہ مصلحت خود
بازی کبھی عشق لے گیا بھی

حالات نے دی نہ ہم کو مہلت
حالات کا رخ بدل گیا بھی

کیا کیا ہیں گمان دل میں لرزاں
اک قہر ہے عرض مدعا بھی
پہنچے بھی تو زلف مشکبو تک
پھرتی تو ہے در بدر صبا بھی
روشن تھی یہ بزم جس سے عاقل
کب کا وہ چراغ جل بجھا بھی

لائل پور
۳ مارچ ۱۹۶۴ء

رہ گزار دل سے ہم کو کشاں کشاں گزرے
پھر بھی سیکڑوں صدمے ہم پہ ناگہاں گزرے

دور تک لب ساحل ریت کے گھروندے ہیں
اب جہاں سے جی چاہے سیل بے کراں گزرے

زخم کر گئی تازہ بے رخی بہاروں کی
ہم الم نصیبوں پر پھول بھی گراں گزرے

عمر بھر چلے جن پر ہم اور نہیں ہارے
ان مہیب راہوں سے تم ابھی کہاں گزرے

موتیوں سے بھر دی ہے رہگزار اشکوں نے
جب بھی وادی دل سے غم کے کارواں گزرے

پشاور
۱۹۶۴ء

کسی کی بزم سے اب رسم و راہ بھی نہ رہی
وہ زندگی جو کبھی تھی وہ زندگی نہ رہی
انہیں کے دم سے فروزاں تھی بزم لالہ و گل
وہ کیا گئے کہ بہاروں میں دلکشی نہ رہی
کچھ اس طرح غم دوراں سے رسم و راہ چلی
کسی بھی لطف سے مانوس زندگی نہ رہی
ستم اب اور زمانہ کرے گا کیا ہم پر
تجھے بھی چھین لیا تیری یاد بھی نہ رہی
جفا نہ چھوڑ کر یہ لذت دوام کہاں
تری وفا کا بھروسہ رہی رہی نہ رہی
تصورات نے اس درجہ راحتیں بخشیں
کہ دل میں حسرت دیداریار بھی نہ رہی !

نگار زیست نے زلفیں سنوار لیں شاید
نظام دہر میں پہلی سی برہمی نہ رہی
عجیب تر تھے حوادث کے سلسلے عاقل
بہار میں بھی گلوں پر شگفتگی نہ رہی

لائل پور
۲۲ جون ۱۹۶۲ء

وقف حسرت بھی نہیں صرف تمنا بھی نہیں
دل ہے ظالم کہ کسی طور بہلتا بھی نہیں

بزم کی بزم ہے بے کیفیِ موسم سے اداس
تیری نظروں میں کوئی شوخ اشارہ بھی نہیں

دھول سی اڑتی ہے مدت سے سرِ راہ خیال
اب تصور میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں

حسن کی سعیِ تبسم پہ گراں گزرا ہے
اف وہ آنسو جو مری آنکھ سے ٹپکا بھی نہیں

وہ نہیں ہیں تو نہ ہوں اور کوئی بھی کیوں ہو
اب ہمیں ان کے سوا کوئی گوارا بھی نہیں

ابر مفہوم نہ سمجھا تری انگڑائی کا
گھر کے آیا بھی نہیں ٹوٹ کے برسا بھی نہیں

اف وہ عالم نگہِ شوق کی حیرانی کا
سامنے آئے بھی وہ اور انہیں، دیکھا بھی نہیں

ہم جہاں بیٹھ گئے پھول کھلا کر اٹھے
ہم سا دنیا میں کوئی انجمن آرا بھی نہیں

اک عجب دھند سی ہے سارے گلستاں پہ محیط
گھپ اندھیرا بھی نہیں صاف اجالا بھی نہیں

دل بے تاب کا کیا کیجئے عاقل کہ اسے
تاب فرقت بھی نہیں دید کا یارا بھی نہیں

لائل پور
۵ جولائی ۱۹۶۲ء

وہ رہ نورد کہ بے نام و نشاں گزرے
وہی حیات کی منزل کے رازداں گزرے
چمن میں ہو کے رہی عام رسم لالہ و گل
وہ لاکھ صحن گلستاں سے بے نشاں گزرے
شب فراق کی تاریکیاں بھی شاہد ہیں
ہم آنسوؤں میں لئے حسن کہکشاں گزرے
نفس نفس تھا معطر نظر نظر سرشار
مرے قریب سے وہ آج ناگہاں گزرے
تری نظر نے تراشے تھے جو بھی افسانے
وہی حیات کا عنوان دلستاں گزرے
عجیب دور تھا وہ دور گلستاں کی قسم
بھری بہار میں ہم لوگ نوحہ خواں گزرے
یہ فیض تھا نگہ مست کا کہ ہم عاقل
نظر نظر میں لئے کیف بیکراں گزرے

لائل پور
۲۰ جون ۱۹۶۲ء

اک ستم اور بھی ہو ترک ستم سے پہلے
چھین لے یا خلش عشق بھی ہم سے پہلے

میں ترے غم کے تصدق مری تقصیر معاف
میں ہی آگاہ نہ تھا عظمت غم سے پہلے

کیف و کم دولت جاں بخش سہی ہمنفسو
روح آزردہ تھی احساس الم سے پہلے

آپ چھیڑیں تو ذرا ربط افسانہ غم
دل امڈ آئے گا خود دیدہ نم سے پہلے

منزلیں راہ رواں پر تھیں مقفل گویا
راستے گم تھے ترے نقش قدم سے پہلے

اب غم عشق بھی دے لذت آزار کے ساتھ
لوگ واقف تھے کہاں تیرے کرم سے پہلے

تجھ سے پہلے بھی بہت صورتیں ابھریں دل میں
سیکڑوں بت ہوئے تعمیر حرم سے پہلے
کتنا پر پیچ تھا افسانہ ہستی عاقل
لاکھ عنوان تھے عنوان رقم سے پہلے

لائل پور

۱۸ جون ۱۹۶۲ء

چمن میں برسا رہی ہے مستی ہوا سراپا خمار ہو کر
وہ آج پھر گنگنا رہے ہیں مغنئی نو بہار ہو کر
کسی کو پھر ڈھونڈتی ہیں نظریں رہین صد انتظار ہو کر
کوئی تو آئے گا گلستاں میں پیام ابر بہار ہو کر
روش روش پھول کھل رہے ہیں کلی کلی مسکرا رہی ہے
مغنیان چمن چلے ہیں قطار اندر قطار ہو کر
انہیں یہ موقوف ہو گئی ہے غم محبت کی بے نیازی
وہ چند آنسو جو میری آنکھوں سے بہہ گئے بیقرار ہو کر
مجھے انہیں رہ رووں کے نقش قدم کی ہے جستجو ابھی تک
جو منزلوں پر بھی مسکرائے ہیں راستوں کا غبار ہو کر
بہار بھی جن کی نکہتوں پر فریب بن کر نہ چھا سکے گی
کچھ ایسے گل بھی کھلے ہیں عاقل مزاج گلشن پہ بار ہو کر

لائل پور
۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء

نین ستارے جل اٹھے ہیں آنسو بھر بھر آئے ہیں
ہم نے اندھیاری راتوں میں پیار کے دیپ جلائے ہیں
برکھا کی اس ہریالی میں زخم بھی ہم نے کھائے ہیں
انگارے چن چن کر لیکن پھول ہی پھول لٹائے ہیں
کتنے سورج مکھ ابھرے اور اندھیاروں میں ڈوب گئے
تیری یاد کے آنچل پھر بھی نگر نگر لہرائے ہیں
ہم سے روٹھ کے جانیوالے تجھ کو کچھ معلوم بھی ہے
تیرے بعد بھی تیرے قصے جی بھر کر دہرائے ہیں
عشق کے مارے یوں پھرتے ہیں وقت کے تپتے صحرا میں
جیسے تیرے گیسو پیارے بادل بن کر چھائے ہیں
دامن دامن اوس گری ہے بوجھل بوجھل پلکوں سے
آج کسی کی یاد میں عاقل نین کنول مرجھائے ہیں

لائل پور

۲۷ جون ۱۹۶۲ء

غم دل کیا جنون مدعا کیا
محبت ہے تو ہنگامے ہیں کیا کیا

ہجوم لالہ و گل سے نہ جانے
طلب فرمائے گی باد صبا کیا

بلا سے تیز تر ہو صر صر غم
بجھا سکتی ہے فانوس وفا کیا

شکست دل سے اک آواز آئی
محبت کیا محبت کا صلہ کیا

مسلسل بجلیاں بل کھا رہی ہیں
کہیں کوئی نشیمن پھر بنا کیا

تری بیگانگی پر دل ہے شیدا
تری بے التفاتی کا گلا کیا

کہاں پہنچا دیا اے خضر ہستی
یہی ہے محشرستان بقاء کیا

نظر سے دفعتاً یہ کون گزرا
یکایک دل کی حالت کو ہوا کیا

یہی ہے بارگاہ حسن عاقل
طلب ہے اے فقیر بے نوا کیا

خیرپور
۱۰ جنوری ۱۹۵۹ء

حاصل نہیں رہا غم حاصل نہیں رہا
دل کی حکایتیں تو رہیں دل نہیں رہا

ذوق سفر کے ساتھ بڑھا ذوق بے خودی
منزل کا ہوش بھی سر منزل نہیں رہا

وہ کیا گئے نگاہ کو ویران کر گئے
محفل میں کوئی رونق محفل نہیں رہا

اک دل پہ ناز تھا مگر اے چشم نیم باز
اب دل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

اے حسن یار بزم تصور سے کیا گریز
اب پردہ نگاہ بھی حائل نہیں رہا

اک سیل بے پناہ کی زد پر ہے زندگی
ساحل تو کیا تصور ساحل نہیں رہا

عاقل کسی کا لطف رفاقت زہے نصیب
احساس دلفریبی منزل نہیں رہا

خیرپور
۲۵ اپریل ۱۹۵۹ء

عشق ہی کا غم نکلا اے غم جہاں اپنا
دیکھ پھر نکھر آیا رنگ داستاں اپنا
خامشی میں ہے پنہاں گریہ محبت بھی
مختلف ہے عالم سے مسلک فغاں اپنا
روز روز کے طوفاں آئے دن کے ہنگامے
خود جلا دیا آخر ہم نے آشیاں اپنا
ہم رضا کے بندوں کو زندگی کی کیا حسرت
آؤ یوں بھی کر دیکھو آج امتحاں اپنا
ہیں وہیں وہیں چرچے آج بھی محبت کے
ذکر چھوڑ آئے ہیں ہم جہاں جہاں اپنا
کون اپنے سر لیتا دو جہاں کے غم عاقل
کام آ گیا آخر قلب ناتواں اپنا

خیرپور
۱۹۶۹ء

خنداں بحد کون و مکاں کیوں نہیں ہو تم
اک مسکراہٹوں کا جہاں کیوں نہیں ہو تم
ہوش و حواس و عقل کے دشمن نہیں تو کیوں
آخر حریف تاب و تواں کیوں نہیں ہو تم
دل کی شکست ہی پہ مصر ہو تو کس لئے
قدر آشنائے شیشہ گراں کیوں نہیں ہو تم
اب تم کو بزم لالہ و گل سے ہے کیوں گریز
صحن چمن میں شعلہ فشاں کیوں نہیں ہو تم
پھولوں پہ رنگ و بو کے حوادث گزر گئے
اب تک سکوت گل کی زباں کیوں نہیں ہو تم
وہ دل کہ ہے شہید روایات عاشقی
اس دل کے شہر یار جواں کیوں نہیں ہو تم
عاقل یہ بے رخی بھی محبت کی ہے دلیل
ممنون التفات نہاں کیوں نہیں ہو تم

ملتان
۱۳ستمبر۱۹۵۸ء

منزل اگر نہیں ہے نہ ہو جستجو تو ہے
ان سے خیال ہی میں سہی گفتگو تو ہے
ہم آج بے نیاز بہار و خزاں سہی
ہم کو چمن سے دور غم رنگ و بو تو ہے
ناکام التفات ہیں لیکن بہ فیض عشق
ہم مطمئن ہیں دل میں کوئی آرزو تو ہے
پھر کیوں حریف عشق و وفا ہے ہر ایک ذات
اے دل کہ تجھ میں آہ نہ کرنے کی خو تو ہے
یہ تہمت خفی بھی گراں ہے مرے لئے
اے ضبط آرزو خلش آرزو تو ہے
راس آ ہی جائیں گی مری تنہائیاں مجھے
کوئی اگر نہیں ہے نہ ہو دل میں تو تو ہے
کلیوں کے پیرہن ہیں دلوں کی طرح سے چاک
پھولوں میں سانحات وفا کی نمو تو ہے!!

وحشت نے زخم اور ہرے کر دیئے تو کیا
اک عالم بہار مرے روبرو تو ہے

میں بھی جو ہوش ہاتھ سے جانے نہ دوں تو کیا
دیوانہ گر یہ گردش جام و سبو تو ہے

اس دل کے ٹوٹنے کی انہیں کو خبر نہیں
یہ تذکرہ زباں بہ زباں کو بہ کو تو ہے

عاقل یہ اضطراب مسلسل بھی کم نہیں
اب وہ ہمیں ملیں نہ ملیں جستجو تو ہے

ملتان
۳۱ مئی ۱۹۵۸ء

چشمِ محبت اللہ اللہ افسوں بھی افسانہ بھی
ہم نے اپنے ہاتھ سے آخر توڑ دیا پیمانہ بھی

اے دل میں گھر کرنے والے تجھ کو کچھ معلوم بھی ہے
بستی بستی دیکھ پھرے ہم ویرانہ ویرانہ بھی

جوشِ جنوں میں تند بگولے منزل منزل ساتھ رہے
صحرا صحرا خاک اڑا کر آیا ہے دیوانہ بھی!

جوت جگائی دل میں کیا کیا مست نگاہ ساقی نے
یوں کھنکائے جام کسی نے گونج اٹھا میخانہ بھی

رات گئے تک شمعِ شبستاں جلتے جلتے راکھ ہوئی
دیکھتے دیکھتے محفلِ شب میں خاک ہوا پروانہ بھی

ہائے رے یہ اندازِ تغافل اف وہ محبت کا عالم
ہم سے ملے بیباکانہ بھی ہم سے رہے بیگانہ بھی

تعمیر و تخریبِ محبت آپ کی مرضی آپ کی بات
آپ ہی مہماں خانہ دل میں آپ ہی صاحب خانہ بھی

ملتان
۱۹۵۸ء

بدلے جو نہ ماحول تو نغمات کا کیا ہے
باطل ہیں کمالات کمالات کا کیا ہے

اب کس کو ضرورت کہ وہ مائل بہ کرم ہوں
اب غم ہے میسر تو عنایات کا کیا ہے

کتنے ہی کٹھن دور تھے جو بیت گئے ہیں
بگڑی ہوئی اس صورت حالات کا کیا ہے

وہ حسن کے اظہار جفا پر ہیں پشیماں
ان کو ہے اگر غم تو مری ذات کا کیا ہے

آنکھوں سے جو لگتی ہے جھڑی اس کی کہاں بات
آئے بھی جو برسات تو برسات کا کیا ہے

چھوڑو کہ ہے بے فائدہ روداد محبت ,!
جب دل ہی نہیں دل کا حکایات کا کیا ہے !

بگڑے ہوئے تیور ہیں زمانے کے تو پھر کیا
اے ہم نفسو گردش حالات کا کیا ہے

ناراض مری بات پہ تم ہو گئے نا حق !!
میری بھی کوئی بات مری بات کا کیا ہے
ہم سادہ طبیعت ہیں بتا اے بت کافر
مفہوم تری چشم عنایات کا کیا ہے
رونا ہی مقدر میں جو لکھا ہے تو اے دوست
پھر کیا سحر و شام کا دن رات کا کیا ہے
کس بات کا عاقل کی برا مان گئے تم
چھوڑو بھی کہ اس رند خرابات کا کیا ہے

ملتان

۲۰ فروری ۱۹۵۸ء

دل میں وہ کیوں نہیں جو نگاہوں سے دور ہے
اے اضطراب شوق یہ کس کا قصور ہے
وہ پیکر حسیں کہ بہر رنگ نور ہے
سر تا قدم بہار مجسم سرور ہے
اس چشم تمکنت سے جو دل چور چور ہے
اب تو ہمیں بھی ناز ہمیں بھی غرور ہے
اب ہجر و وصل یار سے ہے بے نیاز دل
غم پر ہے دسترس تو خوشی پر عبور ہے
اس کائنات سود و زیاں میں مرا وجود
اک کرب آگہی ہے عذاب شعور ہے
خود چھٹ گئے ہیں غم کے اندھیرے کہ تیری یاد
قرطاس شام ہجر پہ تحریر نور ہے

کانوں میں گونجتی ہے اک آواز دل نشیں
کوئی نہ کوئی قریہ جاں میں ضرور ہے
اس کا وجود میرے لئے جنت نظر
عاقل وہ دل کشی میں سراپائے حور ہے

ملتان

۷ فروری ۱۹۵۸ء

حسین یاسمن و لالہ و گلاب نہیں
جواب کیا ہو ترے حسن کا جواب نہیں

نہیں ہے غم جو میسر نہیں پیالہ و مے
تری نگاہ بہت ہے اگر شراب نہیں

کسے نہیں ہے تری زلف پرشکن کی ہوس
وہ کون ہے کہ جو آشفتہ و خراب نہیں

نہ منہ بگاڑ کہ یہ دختِ رز ہے اے زاہد
کچھ ایسی تلخ تو انگور کی شراب نہیں

ترے سوال کا باقی تو ہے بھرم اے دل
یہ اس کا خاص کرم ہے کہ بے نقاب نہیں

یہ ایک دور پر آشوب ہے خدا کی قسم
یہ ہم جو دیکھ رہے ہیں یہ کوئی خواب نہیں

فضا میں موت کے آثار پائے جاتے ہیں
اب اک سکوت مسلسل ہے اضطراب نہیں
ہمارے دم سے تھی وابستہ داستان عمل
جو ہم نہیں تو زمانے کو انقلاب نہیں
ہنر ہنر ہے کسی رنگ میں ہو جلوہ نما
نہ بھولیئے کہ حقیقت کبھی سراب نہیں
عجیب تر ہیں محبت کے فلسفے عاقل
جو کامیاب رہا ہے وہ کامیاب نہیں

بہاولپور
۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء

آئی جو دل میں یاد گلستاں کبھی کبھی !
آنسو لرز اٹھے سر مژگاں کبھی کبھی !

دی ہیں ترے خیال سے دل کو تسلیاں
یوں بھی اٹھائے ہیں ترے احساں کبھی کبھی

ہو تیری عمر عمر دراز اے قدوم یار !
خود جگمگا اٹھا ہے شبستاں کبھی کبھی

محسوس کی ہے ہم نے دو عالم میں برہمی
لہرا گئی جو زلف پریشاں کبھی کبھی

رکھ لی ہے فصل گل ہیں غم عاشقی کی شرم
کام آ گئے ہیں سینہ فگاراں کبھی کبھی

جب آ گیا ہے کوئی سر بزم بے نقاب
خود بجھ گئی ہے شمع فروزاں کبھی کبھی

یہ بھی ستم ہوا ہے کہ عہد بہار میں
سینے پڑے ہیں چاک گریباں کبھی کبھی

تھی خندہ چمن میں جو اک طنز کامیاب
شرما گئی عروس بہاراں کبھی کبھی

عاقل در حبیب سے ہم دور تھے مگر
پہنچے بہ فیض گردش دوراں کبھی کبھی

بہاولپور
۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

حسن تصورات ہے تصویر یار میں
ورنہ کہاں بہار کا عالم بہار میں

یہ حادثہ بھی سب سے الگ ہے بہار میں
گل خوش ہیں اک تبسم ناپائیدار میں

لے اے نگاہ تیرہ دروں ہم سے لے سبق
ہم دل جلا رہے ہیں شب انتظار میں

اشکوں کی جلوہ گاہ بنی ہے شب فراق
اک کہکشاں ہے چشم ستارہ شکار میں

عہد جنون و فصل بہاراں کی یادگار
اک داستاں ہے پیرہن تار تار میں

ہو یہ بھی اک فریب تسلی تو کیا علاج
کچھ پھول مسکرا تو دیئے ہیں بہار میں

یہ بھی کہیں نگار سحر کے نہ ہوں قریب
موتی سے ہیں جو دامن ابر بہار میں

پھولوں کی بے ثبات ہنسی پر نہ طنز کر
شبنم کے اشک بھی تو نہیں اختیار میں

اب تیرا انتظار بھی شاید نہیں رہے
اب اور ہی لگن ہے دلِ بے قرار میں

اس حسنِ التفات کی راحت کسے نصیب
اک لطفِ خاص ہے ستمِ جار بار میں !

عاقلؔ کسی کی چشمِ توجہ کے میں نثار
فرق آ گیا ہے گردشِ لیل و نہار میں

بہاولپور
۶ دسمبر ۱۹۵۷ء

وفا کی سعی آخر بھی اگر ناکام ہو جائے
ترا احسان ہم پر گردش ایام ہو جائے

حدیث کیف و مستی پھر حدیث عام ہو جائے
محبت اہل دل کا مستقل پیغام ہو جائے

بلانوشی بلا سے مورد الزام ہو جائے
ضرورت ہے کہ ہر تلخی غریق جام ہو جائے

چمن میں لالہ و گل کی حکایت عام ہو جائے
ابھی وہ مسکرا دیں اور سحر گلفام ہو جائے

ہمیں سمجھا ہے کیا اے ناصح ناداں جو ہم چاہیں
پیالے میں مقید گردش ایام ہو جائے

یہ دل کی بے کلی خود ہی ستمگر ہو تو کیا کیجئے
محبت ہی نہ کیوں پھر مورد الزام ہو جائے

ابھی محدود ہر احساس دل کی دھڑکنوں تک ہے
ضرورت ہے کہ ہر آواز طشت از بام ہو جائے

قیامت ہے کہ ساقی ہم شراب ناب کو ترسیں
ستم ہے تیرے ہوتے تشنہ کامی عام ہو جائے

ہمیں مت پوچھئے ہم رہ رو راہ محبت ہیں
جو ہم چاہیں تو منزل قسمت ہر گام ہو جائے

کسی کے حسن کو حسن پشیماں کون دیکھے گا
جو ہونا ہے تو جذب عشق ہی ناکام ہو جائے

ابھی تو جان باقی ہے ابھی سے بے رخی کیسی
نظر اک اور بھی اے ساقی گلفام ہو جائے

بجا ہے ناز ہے مجھ کو اگر اپنی تباہی پر
محبت میں وہ خوش قسمت ہے جو ناکام ہو جائے

غم ہستی سے سرتابی کسی صورت نہیں ممکن
غزل ہر چند عاقل نغمہ الہام ہو جائے

بہاولپور
۶ دسمبر ۱۹۵۷ء

میں اقرار حق برملا چاہتا ہوں
تجھے اک نظر دیکھنا چاہتا ہوں
مرے تجربے تلخ تر ہیں رفیقو
غلط ہے کہ میں رہنما چاہتا ہوں
مجھے اپنے ذوق سفر کی قسم ہے
میں ہر گام اک حادثہ چاہتا ہوں
مہک جن میں ہو اس لباس حسیں کی
وہ گلہائے رنگیں قبا چاہتا ہوں
مجھے مرحبا کہہ کہ میں اے محبت
نگاران کافر ادا چاہتا ہوں
چلے آؤ بے پردہ و بے تکلف !
کہ میں نقش حیرت بنا چاہتا ہوں

کمند نظر پھینک دو جس پہ چاہو
شکار نظر دیکھنا چاہتا ہوں
مجھے صرف درکار ہے غم نصیبی
کہ میں صرف تیری رضا چاہتا ہوں

بہاولپور
۲۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء

اب درد میں لذت ہے اب درد میں راحت ہے
دے غم کہ مجھے ظالم اب غم کی ضرورت ہے
ارباب جنوں کی بھی کیا طرفہ طبیعت ہے
گل ہی سے نہیں رغبت کانٹوں سے بھی الفت ہے
اس دل میں جو پوشیدہ تصویر محبت ہے
تیرا ہی سا نقشہ ہے تیری ہی سی صورت ہے
منصور سے وابستہ جو کچھ بھی روایت ہے
یا حوصلہ جاں ہے یا دل کی جسارت ہے
ہر کار وفا میں ہے امید وفا شامل
اب میری محبت بھی توہین محبت ہے
ارباب طرب مجھ پر ہنستے ہیں تو ہنسنے دو
غم ہی مرا سرمایہ غم ہی مری دولت ہے
انصاف و صداقت ہیں اس دور میں نامحکم
اس عہد میں بدعہدی معیار شرافت ہے

ہر شے ہے سراب آسا ہر فکر ہے وہم آگیں
اب ہم کو کسی شے سے رغبت ہے نہ نفرت ہے

دامن پہ ترے چھینٹے ہیں خون محبت کے
دامن کا لہو خود ہی تصدیق شہادت ہے

اس بزم سے محرومی اے ضبط جنوں کب تک
لے اب تو مجھے لے چل آگے مری قسمت ہے

ہر لحظہ حوادث کی یورش ہے مگر عاقل
خونابہ گہ دل میں اب ہے تو محبت ہے

بہاولپور
۲۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء

روئے نگار صبح کہاں چشم تر کہاں
یہ سب فریب فکر و نظر ہے سحر کہاں
اب تیری جستجو ہے تو اب کس کو ہوش ہے
منزل کہاں قیام کہاں رہگذر کہاں
پھولوں نے کیوں اڑائے ہیں شبنم کے مضحکے
غم مستقل نہیں تو خوشی معتبر کہاں
ہم کو جنوں میں ہوش و خرد پر ہے اختیار
ہر چند بے خبر ہیں مگر بے خبر کہاں
ہے ضبط غم ہی اصل میں معیار ظرف عشق
اشکوں میں لوگ ڈھونڈ رہے ہیں گہر کہاں
کرتے بھی کیا جو سر نہ کٹاتے بہ فصل گل
خاموش بیٹھتے بھی تو شوریدہ سر کہاں

ہفت آسماں میں میری نگہ سے پڑے شگاف
تاروں کو صرف توڑ کے لاتی نظر کہاں

ہم سے الم شکار و حوادث پرست لوگ
اس کارگاہ دہر میں بار دگر کہاں

آگے تری خوشی ہے مگر اے مزاج یار
جب میرا سر نہیں تو ترا سنگ در کہاں

عاقل مزاج گردش دوران ہے مضمحل
یہ دیکھ کر کہ ہم ہیں تو وہ معتبر کہاں

بہاولپور
ستمبر ۱۹۵۷ء

چہرہ بھی زرد آنکھ بھی نم آشنا نہیں
اس احتیاط غم کی کوئی انتہا نہیں
وہ بھول جائیں بھی تو یہ دل بھولتا نہیں
زنداں سے چھوٹ کر بھی یہ قیدی رہا نہیں
یا خود ہی حادثات زمانہ کو ہے سکوت
یا مجھ میں اب جسارت مہر و وفا نہیں
ہر لحظہ برق و باد ہیں ہر آن زلزلے
یوں جی رہے ہیں جیسے ہمارا خدا نہیں
اک ریگ بے نشاں ہے جدھر ڈالئے نظر
اب دور دور تک بھی کوئی نقش پا نہیں
یہ کیا ہوا کہ آپ مرے ساتھ رو دیئے
اک دل کو ٹوٹنا ہے کوئی حادثہ نہیں

بیٹھے ہیں مطمئن جو نشیمن جلا کے ہم
کتنا سکون ہے جو کوئی آسرا نہیں
عاقل سے ایک بار تو اے دوست مل کے دیکھ
کچھ بھی سہی وہ شخص مگر بے وفا نہیں

بہاولپور
۱۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

گذر جاؤ حدود لالہ و گل سے صبا ہو کر
چلے بھی آؤ گلشن میں مغنی کی صدا ہو کر

ابھی کچھ احتیاط بے خودی ملحوظ ہے شاید
وہ گذرے ہیں مرے دل سے مگر نا آشنا ہو کر

محبت ایک جذب نا تمامی ہے خدا رکھے
ہمارا نام زندہ ہے محبت میں فنا ہو کر

یہ دنیا اک فریب شوق بن کر رہ گئی یکسر
یہ دل کیا ہو گیا آئینہ عالم نما ہو کر

اک آہٹ سی جو شام غم مجھے محسوس ہوتی ہے
وہ آئے ہیں شکست شیشہ دل کی صدا ہو کر

مجھے منظور ہے کونین کی خوشیوں کا ٹھکرانا
جو مل جائے کسی کا درد درد بے دوا ہو کر

غم پرواز تو عہد اسیری میں نہ تھا عاقل
قفس کو بھول جاتے ہم جو اڑ سکتے رہا ہو کر

بہاولپور
۳۰ اگست ۱۹۵۷ء

فیصلے عشق کے تلوار تک آ پہنچے ہیں
تیرے عاشق رسن و دار تک آ پہنچے ہیں

بات سے بات نکلتی ہے خدا خیر کرے
تذکرے قلب گنہگار تک آ پہنچے ہیں

آئیں اور دار و رسن چوم کے دیکھیں تو ذرا
کون ہیں جو مرے معیار تک آ پہنچے ہیں

احترام غم ایام کا کچھ دیں تو ثبوت
وہ جو اب شوخی گفتار تک آ پہنچے ہیں

وہ جو آسودہ ساحل ہیں کوئی ان سے کہے
کچھ سفینے ہیں کہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

کچھ اڑائے ہیں مری چاہ کے قصے دل نے
کچھ فسانے نگہ یار تک آ پہنچے ہیں

کس کو معلوم کہ منزل پہ یہ پہنچیں کہ رہیں
راہ رو وادیِ پرخار تک آ پہنچے ہیں

زندگانی کی کڑی دھوپ کے مارے ہوئے لوگ
پھر ترے سایۂ دیوار تک آ پہنچے ہیں

آتشِ قلب سے بھڑکے ہیں جو شعلے عاقل
برق بن کر مرے اشعار تک آ پہنچے ہیں

نہ جانے کتنے چلے جام ایک جام کے بعد
طلوع ہوتے رہے آفتاب شام کے بعد
وہ حرف شوق بھی کیا تھا کہ راز تھا جب تک
وہ ہم سے روٹھ گئے جرات کلام کے بعد
جو ہم نہیں تو محبت میں کچھ نہیں اے دوست
ہمارانام ضروری ہے تیرے نام کے بعد
اب ان کا ذوق سفر ذوق مدعا معلوم
جو تھک کے بیٹھ گئے ہیں ہر ایک گام کے بعد
وہ مے نہیں کہ جو مستی میں چھین لے سب ہوش
وہ رند کیا جو بہک جائے ایک جام کے بعد
ہمارے بعد بھی ذکر وفا پہ ہے بندش
یہ حوصلے ہیں محبت میں انتقام کے بعد
شراب بھر کے یہ ساقی نے کیا کیا عاقل
سبھی کے ٹوٹ گئے دل شکست جام کے بعد

بہاولپور
۲۵ اگست ۱۹۵۷ء

وجہ تسکین محبت میں ستم ہوتا ہے
وہ جفا کرتے ہیں ہم پر تو کرم ہوتا ہے
کیا یہ افسوں محبت ہے کہ اعجاز وفا
تیری آنکھوں سے نمایاں مرا غم ہوتا ہے
مجھ کو محسوس تو ہوتی ہے محبت کی خلش
درد ہوتا تو ہے ہر چند کہ کم ہوتا ہے
ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ دیوانہ ہوں
اس محبت کا بھی کیا خاک بھرم ہوتا ہے
کون سا کام ہے دنیا سے گزرنا عاقل
اک نفس کا یہ سفر تا بہ عدم ہوتا ہے

بہاولپور
۶ ستمبر ۱۹۵۷ء

پیانہ بکف کون یہ گزرا ہے ادھر سے
فانوس بجھے جاتے ہیں لمعات نظر سے
شبنم سے تعلق ہو نہ کوئی گل تر سے
کیا ہو جو صبا چھین لے آئینہ سحر سے
مل جائے اشارہ جو تری مست نظر سے
بادل ابھی گھر آئے ابھی ٹوٹ کے برسے
اے پردہ نشیں ہم نے بہ فیضان تصور
دیکھے ہیں وہ جلوے کہ جو پنہاں تھے نظر سے
دوشیزہ صہبا تھی ہر اک گام پہ رقصاں
گزرے ترے پیانہ بلب رند جدھر سے
رہتا جو ہمیں ہوش تو اے چشم فسوں ساز
دیتے تجھے تشبیہہ کسی شعبدہ گر سے
لے چل کہ یہ جاں نذر ہے اے تیر محبت
یہ حق تو ادا ہو گا نہ دل سے نہ جگر سے

ہم ہیں تو محبت کا ابھی نام ہے باقی
ہم ہیں تو حوادث بھی گذر جائیں گے سر سے
وہ ظلمت حالات میں پھر ڈوب گئے ہیں
خورشید جو ابھرے تھے گریبان سحر سے
اپنوں کی شقاوت سے نہ تھے سینہ و دل چاک
آرام قفس میں تھا زیادہ مجھے گھر سے
اک پرسش احوال بھی کیا قہر تھی عاقل
طوفان اُمڈ آئے مرے دیدہ تر سے

بہاولپور
۱۴ اگست ۱۹۵۷ء

خزاں کا دور بھی ہر چند بے ضرر تو نہ تھا
مگر بہار میں جو غم ہے پیشتر تو نہ تھا

مچلنا اے دل بے تاب اس قدر تو نہ تھا
مژہ پہ اشک تھا منصور دار پر تو نہ تھا

تری خوشی ہے تو پھر چھین لے خوشی اے دوست
کہ غم کو دیکھ لیا غم بھی معتبر تو نہ تھا

لرز اٹھے تھے شب ہجر گو نجوم و قمر
جو وہ نہ آئے تو آہوں میں کچھ اثر تو نہ تھا

یہ اس کی خاص عنایت کہ اس نے قدر تو کی
میں جانتا ہوں کہ آنسو مرا گہر تو نہ تھا

یہ کیا کہ حسن کی آنکھوں میں اشک بھر آئے
خراب عشق مرا حال اس قدر تو نہ تھا

ستم کے پھول کھلے غم کے برگ و بار آئے
نہال عشق کوئی نخل بے ثمر تو نہ تھا

نگاہ بادہ کشاں سے تھی رات ضو ریزی
شراب خانے میں خورشید جلوہ گر تو نہ تھا

اس ارتباط کا انجام خیر ہو یا رب
یہ التفات حسیں مسلک نظر تو نہ تھا

خوشی جو تو نے عطا کی وہ مستقل تو نہ تھی
جو درد تو نے دیا درد معتبر تو نہ تھا

یہ کس نے خرمن ہستی جلا دیا آخر
نگاہ لطف و کرم تھی کوئی شرر تو نہ تھا

ہے موت دل کے لئے اب یہ حسرت پرواز
قفس کی قید میں اندوہ بال و پر تو نہ تھا

کھٹک سی دل میں جو باقی ہے آج تک عاقل
وہ تھا جو پیک نظر ناوک نظر تو نہ تھا

بہاولپور

۲۷ جولائی ۱۹۵۷ء

دل کو اسیر لالہ و ریحاں نہ کر سکے
یعنی ہم احترام بہاراں نہ کر سکے

افسوس ہم چھپا نہ سکے راز آرزو
کچھ احتیاط جیب و گریباں نہ کر سکے

کچھ بھی نہ کر سکے پئے انسانیت جو ہم
انساں کو محرم غم انساں نہ کر سکے

ہم بھی مقیم صحن گلستاں تو تھے مگر
پھولوں سے پر بہار میں داماں نہ کر سکے

یوں چشم باغباں میں کھٹکتے رہے کہ ہم
تائید کاروبار گلستاں نہ کر سکے!

ہم پر بھری بہار میں گذرے وہ سانحات
سینوں کے داغ بھی تو نمایاں نہ کر سکے

شکوہ رہے گا ہم کو غم روزگار سے
وہ روز بھی تو ہم غم جاناں نہ کر سکے

میانوالی
۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء

ہے تقاضا کہ ہو پھر مظہر جذبات غزل
گنگنانے دے مجھے اے غم حالات غزل

اب تو موسم ہی پہ موقوف ہے احساس طرب
ساتھ لے آئی کبھی آئی جو برسات غزل

عالم عشق میں کیا کیا نہیں باوصف جنوں
رمز و الہام غزل کشف و کرامات غزل

روح مستی میں جو پوشیدہ ہے اک لال پری
شیشہ دل میں ہے صہبائے خیالات غزل

کہکشاں زار میں ہے نقش ثریا سے سوا
مطلع فن پہ ہے خورشید کمالات غزل

انگبیں زا ہے بہ اعجاز معانی ہر چند
تیر و نشتر سے نہیں کم بصد اوقات غزل

پھر وہی بزم تصور میں ہے سرگرم سخن
جس کا ہر لفظ رباعی ہے ہر اک بات غزل

وجد میں سب در و دیوار نظر آتے تھے
پڑھ رہا تھا میں سر بزم جو کل رات غزل

موسم گل میں کبھی نشۂ صہبا میں کبھی
لکھ ہی لیتے ہیں بہ پابندیِ اوقات غزل

کیوں نہ روشن ہو سیہ خانۂ عالم عاقل
بزم ہستی میں ہے اک شمعِ خیالات غزل

میانوالی

۲۳ جون ۱۹۵۷ء

کتاب دل میں پھر وہ عمر بھر پیدا نہیں ہوتے
جو افسانے بعنوان نظر پیدا نہیں ہوتے

شب فرقت یہی سوز مسلسل ایک دولت ہے
غنیمت ہے کہ آثار سحر پیدا نہیں ہوتے

چمن والو پرانے زمزمہ سنجوں پہ کیا گزری
تعجب کیا جو اب اہل نظر پیدا نہیں ہوتے

قفس میں بھی خوشی کا اک زمانہ تھا سو ہو گزرا
خزاں ہو یا بہار اب بال و پر پیدا نہیں ہوتے

مجھے اس کارواں کی ہمرہی سے بس یہ شکوہ ہے
کہ باہمت رفیقان سفر پیدا نہیں ہوتے

یہ کیا تذلیل جذب دل ہے اے دل کچھ بتا تو ہی
مرے اشکوں سے کیوں لعل و گہر پیدا نہیں ہوتے

خلوص جستجو میں فرق شاید آ گیا عاقل
کہ اب ٹھوکر سے میری رہگذر پیدا نہیں ہوتے

لاہور
۲۴ مئی ۱۹۵۷ء

ابھی جو قافلہ نو بہار گذرا ہے
بہت طبیعت محزوں پہ بار گذرا ہے
ترے بغیر کبھی آئی ہے بہار تو پھر
ہر ایک پھول نگاہوں میں خار گذرا ہے
وہ جس کو دعویٰ فرزانگی تھا آج وہی
تلاش یار میں دیوانہ وار گزرا ہے
مہک رہی ہیں ہوائیں دمک رہی ہے فضا
یہ آج کون سر رہگذار گزرا ہے
نہ خلوتوں میں خموشی نہ جلوتوں میں سکوں
عجیب تر دل ہنگامہ کار گزرا ہے
کھٹک رہے ہیں جو سینے میں خار سے پیہم
کہیں تصور مژگان یار گزرا ہے!
سمجھ رہے تھے گنہگار جس کو ہم عاقل
گدائے رحمت پروردگار گزرا ہے!

میانوالی
۲۹ مارچ ۱۹۵۷ء

روشن تغیرات کے امکاں ہوئے تو ہیں
ذرے حریف مہر درخشاں ہوئے تو ہیں

پھر دیکھیے کہ رنگ دکھاتی ہے کیا بہار
سینے جراحتوں سے گلستاں ہوئے تو ہیں

شاید یہ جشن آمد فصل بہار ہو
ہم بے نیاز جیب و گریباں ہوئے تو ہیں

ہاتھوں میں دھجیاں ہیں گریباں کی سر میں خاک
نظارہ بہار کے ساماں ہوئے تو ہیں

پھر اک نئی ادا سے دلوں کے معاملات
افسانہ ہائے عشق کے عنواں ہوئے تو ہیں

بے حس دلوں میں جوش محبت اٹھا تو ہے
کچھ اشک صرف یاد شہیداں ہوئے تو ہیں

اب دیکھنی ہیں گردش دوراں کی وسعتیں
ساز حیات نو پہ غزل خواں ہوئے تو ہیں

یہ دیکھنا ہے عقل کہاں رہزنی کرے
جذب جنوں کے عشق سے پیاں ہوئے تو ہیں

اب ساحلوں کے اور نہ کھائیں گے ہم فریب
اب ہم حریف موجہ و طوفاں ہوئے تو ہیں

احساس زندگی تڑپ اٹھے عجب نہیں
کچھ لوگ نذر گردش دوراں ہوئے تو ہیں

ایثار اور چاہتے کیا ہیں جنوں سے آپ
چھینٹے لہو کے زینت داماں ہوئے تو ہیں

ہم نے غم حیات کو اپنا لیا تو ہے
ہم ترجمان شورش پنہاں ہوئے تو ہیں

پھولوں نے چاک کی ہیں قبائیں چمن چمن
کچھ اہتمام جشن بہاراں ہوئے تو ہیں

اتنا تو اپنی وحشت دل نے دیا ہے ساتھ
مانوس ہم سے خار بیاباں ہوئے تو ہیں

آثار برہمی کے ہیں چہروں سے آشکار
سینوں میں تھے جو داغ نمایاں ہوئے تو ہیں
اللہ رے یہ رنگ گلستاں آرزو
ہم حسرتوں پہ اپنی پشیماں ہوئے تو ہیں
آزاد ہو کے قید قفس سے زہے نصیب
عاقل اسیر صحن گلستاں ہوئے تو ہیں

میانوالی

۲۸ مارچ ۱۹۵۷ء

چمن میں جشن بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو
گلوں کا خون پھر ارزاں ہے دیکھئے کیا ہو

نگارشات طرب کیا کہ ذہن شاعر پر
محیط گردش دوراں ہے دیکھئے کیا ہو

جنوں خموش ہے اس دور گمرہی میں مگر
خرد کا چاک گریباں ہے دیکھئے کیا ہو

بہار دام سیاست میں ہے اسیر ابھی
خزاں کی زد پہ گلستاں ہے دیکھئے کیا ہو

گلوں کے چاک ہیں دامن سحر ہے اشک فشاں
یہ اہتمام بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

کچھ اس طرح سے ہے اک رقص اہرمن برپا
کہ جیسے قید میں یزداں ہے دیکھئے کیا ہو

دھواں دھواں ہے رہ منزل وفا یارو
حیات شعلہ بد اماں ہے دیکھئے کیا ہو

غم حیات کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم
بدل رہا ہے زمانہ سنبھل رہے ہیں ہم
دمک رہی ہے تجلی سر جبین سحر
فسوں ظلمت شب سے نکل رہے ہیں ہم
ہمیں جراحت منزل رسی کا خوف نہیں
کہ شہر گل میں بھی کانٹوں پہ چل رہے ہیں ہم
نہ کی قبول کبھی ہم نے مشکلوں میں شکست
جہاد زیست میں صرف عمل رہے ہیں ہم
ہمیں کریں گے بہر طور احترام بہار
گلوں کی آگ میں ہر چند جل رہے ہیں ہم
نئی ہے فکر نئی جستجو نئی ہے امنگ
سیاست غم دل تک بدل رہے ہیں ہم
نواگران جنوں میں تو ہے بھرم اپنا
خرد کی بزم میں گو بے محل رہے ہیں ہم

ہماری عریاں تنی کا فلک اڑا نہ مذاق
یہ خاک ارض وطن ہے جو مل رہے ہیں ہم
کسی سے کم نہ رہے ہم بہ فیض وحشت دل
زہے کہ فاتح دشت و جبل رہے ہیں ہم
نہ جانے خون ہو کس کس کا اے چمن والو
بہار آئی ہے اور ہاتھ مل رہے ہیں ہم
بھٹک نہ جائیں کہیں راستوں میں اہل سفر
چراغ بن کے سر راہ جل رہے ہیں ہم
ہمیں نصیب ہے رعنائی نظر عاقل
کہ صرف بادہ و محو غزل رہے ہیں ہم

بہاولپور
۱۹۵۶ء

بس یہ ہوا کہ گردش حالات تھم گئی
کیا جانئے کہ کس کی نظر کس پر جم گئی
ساقی کے دم سے تھی جو طلب یک قلم گئی
ساقی گیا شکایت بسیار و کم گئی
یہ کیا خبر کہ نور سحر بھی تھا اک فریب
ہم خوش ہوئے تو تھے کہ شب رنج و غم گئی
ناپختگان شوق کو ہوتی بھی کیا خبر
کب صبح عید آئی کہاں شام غم گئی
گزرا یہ کون صحن چمن سے کہ اے ندیم
مٹنے کی آرزو پئے نقش قدم گئی
جن وادیوں میں فکر کے الجھاؤ تھے وہاں
زلف دو تا بسلسلہ پیچ و خم گئی
ہم جی رہے تھے ہم سے تھا مٹنے کا لطف بھی
ہم کیا گئے کہ لذت ہست و عدم گئی

کس نے یہ دل سے گرد کدورت کو دھو دیا
مشہور تھی جو اک صفت جام جم گئی

بوجہل کو بھی دعوئی علم و ہنر ہے آج
افسوس ہے کہ عظمت اہل قلم گئی

اس دور ناسپاس میں عاقل خدا گواہ
دل سے ہر ایک خواہش لطف و کرم گئی

بہاولپور
۱۹۵۶ء

ان سے ہر چند تقابل تو نہیں ہے یارو
دل اسیر خم کا کل تو نہیں ہے یارو

ان سے پیمان شکستہ کی شکایت ہے. ضرور
شکوہ طرز تغافل تو نہیں ہے یارو

ہچکیوں پر ہے اگر درد محبت موقوف
سانس مرہون تسلسل تو نہیں ہے یارو

ایک ہنگامہ کہ برپا ہے پس پردہ دل
حسرتوں کا یہ کہیں غل تو نہیں ہے یارو

درو دیوار گلستاں کہ ہیں مغموم و حزیں
نوحہ فرما کوئی بلبل تو نہیں ہے یارو

وہ جو برگشتہ و بیزار نظر آتے ہیں
اس میں کچھ دل کا تساہل تو نہیں ہے یارو

اب وہ عاقل میں طلب ہے نہ تمنا نہ خروش
یہ کہیں شان توکل تو نہیں ہے یارو

بہاولپور ۱۹۵۶ء

آتش تصور سے روز و شب سلگتے ہیں
جاں دہکنے لگتی ہے نطق و لب سلگتے ہیں

رنج بیکراں لے کر رات جب بھی آتی ہے
دل تمام جلتے ہیں سب کے سب سلگتے ہیں

کوئی کس طرح سمجھے اہل دل کی حالت کو
بے خبر سے رہتے ہیں بے سبب سلگتے ہیں

اک دھواں سا اٹھتا ہے دامن تخیل سے
یاد کے چمن اکثر دل میں جب سلگتے ہیں

کچھ تو آتش گل بھی وجہ سوز غم ہو گی
ان بھری بہاروں میں ہم جواب سلگتے ہیں

دود پر فشاں بن کر کائنات رقصاں ہے
فکر کے الاؤ بھی کیا عجب سلگتے ہیں

برق عشق کیا کوندی خرمن دل و جاں پر
اب یہ حال ہے عاقل روز و شب سلگتے ہیں

بہاولپور
۱۹۵۵ء

کچھ سکوں بخش کچھ آلام اثر ہوتا ہے
درد بھی دل میں بہ انداز نظر ہوتا ہے

وہ جو ایک سلسلہ برق و شرر ہوتا ہے
سب تری چشم محبت کا اثر ہوتا ہے

کیا خبر تجھ کو شب وعدہ نہ آنے والے
دن بھی اب کتنی مصیبت سے بسر ہوتا ہے

ہو جہاں عرض تمنا لب خاموش پہ جرم
وہ بھی اک مرحلہ قلب و نظر ہوتا ہے

جب محبت میں لٹا دیتا ہے سب کچھ کوئی
پھر کہاں واہمہ نفع و ضرر ہوتا ہے

شدت غم میں بھی جو آنکھ سے ٹپکے نہ کبھی
بس وہی اشک حقیقت میں گہر ہوتا ہے

اب تو قابو نہیں مرنے پہ بھی ہم کو عاقل
کتنا مجبور حقیقت میں بشر ہوتا ہے

بہاولپور
۱۹۵۵ء

جو گماں تک نہ آئے جو خیال تک نہ پہنچے
مری بات کیا سمجھتے جو سوال تک نہ پہنچے

ترے چہرہ حسیں تک یہ نظر تو کیا پہنچتی
وہ جو پل رہے تھے فتنے تری چال تک نہ پہنچے

تری جستجو میں آخر جو حد جنوں سے گذرا
میں پہنچ گیا وہاں بھی کہ خیال تک نہ پہنچے

مجھے راس آگیا ہے ترا غم زہے محبت
کہیں اب تری عنایت مرے حال تک نہ پہنچے

ترے پیکر حسیں کی انہیں ہمسری تو کیا ہو
وہ گل و سمن جو تیرے خدوخال تک نہ پہنچے

ترے ہجر کا نہیں غم مجھے خوف ہے تو یہ ہے
کہ یہ رنج بے نہایت مہ و سال تک نہ پہنچے

ابھی اور بھی تو صدمے مری راہ میں ہیں حائل
غم رفتگاں سے کہہ دو غم حال تک نہ پہنچے

بہاولپور
۱۹۵۵ء

سوال ظرف کا ہے ذکر بے خودی تو نہیں
سزائے دار بجرم خود آگہی تو نہیں

سمجھ رہا ہے زمانہ جسے حیات کا غم
تری نگاہ کی اے دوست بے رخی تو نہیں

نہ رسم و راہ محبت نہ ارتباط و خلوص
یہ دوستی کی ہے توہین دوستی تو نہیں

نہ تیرا دھیان ' نہ تیری طلب ' نہ تیری یاد
یہ زندگی کہ جو ہے اب یہ زندگی تو نہیں

ابھی سے کیوں مری آنکھوں میں اشک بھر آئے
ابھی اجازت اظہار غم ملی تو نہیں

وہ التفات پہ مجبور ہو گئے ہیں اگر!
مری وفا کا ہے اعجاز ساحری تو نہیں

تمہاری زلف معنبر سے نسبتیں ہیں ضرور
شمیم گل کو مجال برابری تو نہیں !

نہ جانے کیوں دم رخصت دھڑک رہا ہے دل
کہیں یہ تم سے ملاقات آخری تو نہیں !

بہاولپور
۱۹۵۴ء

دشت غربت سے چلے ارض وطن تک آگئے
ہم نہ جانے کس تمنا میں چمن تک آگئے

جو کبھی مانوس تیرے نام تک سے بھی نہ تھے
وہ بھی اب اے دوست تیری انجمن تک آگئے

عقل بھی جب بے خودی کی زد پہ آئی مٹ گئی
دشت نے جب پاؤں پھیلائے چمن تک آگئے

مصلحت کی راہ میں گم ہو گئے سب اہل ہوش
جو غزالوں کے تھے متوالے ختن تک آگئے

زندگی اک راز سر بستہ تھی افشا ہو گئی
دل کے افسانے حدود شعر و فن تک آگئے

گردش دوراں نے عاقل توڑ دی مہر سکوت
فکر کے اسلوب انداز سخن تک آگئے

بہاولپور
۱۹۵۴ء

نہ کر جہد طلب اے دل تمنا خام رہنے دے
مجھے ناکام رہنا ہے مجھے ناکام رہنے دے

اگر ضبط محبت بھی کوئی جرم محبت ہے
میں اس الزام سے خوش ہوں یہی الزام رہنے دے

ہمارے بعد کردار محبت کو نہ کر رسوا!
ہمارے بعد تو ظالم وفا کا نام رہنے دے

ابھی یہ رہ نور وان وفا سہمے ہوئے سے ہیں
ابھی ان رہ نور دوں کو غم ایام رہنے دے

ترے اس التفات خاص کا صد شکریہ لیکن
مجھے اب تو اسیر گردش ایام رہنے دے

ابھی آغاز ہی سے دل کو مت ممنون کر اتنا
ابھی کچھ روز دل میں کاہش انجام رہنے دے

غنیمت ہے جو ساقی خاص رندوں کیلئے عاقل
خم چشم محبت میں مئے گلفام رہنے دے

بہاولپور
۱۹۵۴ء

جو عشق سے بے خبر گئے ہیں
واللہ تہی نظر گئے ہیں

جذبات کے دم بدم بگولے
پھولوں کو شرار کر گئے ہیں

کتنوں کے اتر گئے ہیں چہرے
گیسو جو کبھی بکھر گئے ہیں

اے دوست بتا کہ تیرے ہوتے
کیوں لوگ یہ دربدر گئے ہیں

اشکوں سے کچھ اور تیرے عارض
پھولوں کی طرح نکھر گئے ہیں

ماحول کی یہ ہما ہمی کیا
طوفاں سے بھی ہم گزر گئے ہیں

موہوم سی اک خلش تھی عاقل
ہم ضبط سے بھی گزر گئے ہیں

بہاولپور
۱۹۵۴ء

کعبہ دل اگر اے دوست صنم خانہ بنے
پھر ترا نقش خدا جانے بنے یا نہ بنے!

سرخیِ دل سے ہو عنوانِ محبت ترتیب
غم اگر ضبط نہ فرمائے تو افسانہ بنے

ہم ہیں وہ رندِ خرابات کہ اے تشنہ لبی
ابھی چاہیں تو ہر ایک گام پہ میخانہ بنے

رسن و دار ہیں خود حسن کا احساسِ شکست
آگہی جراتِ رندانہ بنے یا نہ بنے

سب پہ کھل جائے اس آفت کہ ہستی کا بھرم
گردشِ چرخ اگر گردشِ پیمانہ بنے

جب زمانے کو کسی طور نہیں استقلال
کون پھر مصلحتِ وقت کا دیوانہ بنے!

دل ملا بھی ہمیں عاقل تو طرحدار ملا
ہم بنے بھی تو حریفِ غمِ جاناں نہ بنے

بہاولپور
۱۹۵۴ء

کچھ کیف و انبساط کے سانچے میں ڈھل گئی
کچھ تلخیٔ حیات ہی تیور بدل گئی ! !

سب نے گلوں کی شوخ لباسی تو دیکھ لی
یہ کیا خبر کہ وار قضا کس پہ چل گئی

اے دوست میری کم طلبی کا رنج کر
یہ اور بات ہے کہ طبیعت بدل گئی

دنیائے بے ثبات سے اب بھر چکا ہے دل
یوں مطمئن ہوں جیسے تمنا نکل گئی

یا مجھ کو اب یقین محبت نہیں رہا !
یا تیرے التفات کی صورت بدل گئی

جب تم نہ آئے تھے تو پریشاں تھا ہر نفس
تم آگئے اداس طبیعت بہل گئی

پھر میرے اعتبار محبت کا کیا جواب
یہ بات بھی حضور اگر کل پہ ٹل گئی

بہاولپور
۱۹۵۴ء

خرد کو عشق سے اب سوئے ظن تو کیا ہو گا
مگر وفا کا نہ بدلا چلن تو کیا ہو گا

نہ چھپ سکے گا کسی طور خون لالہ و گل
سنور بھی جائے بہار چمن تو کیا ہو گا

یہ مشکلیں ہیں تو کیا ہو گا مشکلوں کا علاج
مرا وطن نہیں میرا وطن تو کیا ہو گا !

نظر نہ ہو گی جو اہل نظر تو کیا ہو گی
ہنر نہ ہو گا جو معیار فن تو کیا ہو گا

نئی پلاؤ نئے دور کے شرابی کو
اسے مذاق شراب کہن تو کیا ہو گا

کہیں چھپائے سے چھپتی ہیں وحشتیں دل کی
خرد نے سی بھی دیئے پیرہن تو کیا ہو گا

وفا جب آنکھ میں نرگس کے نام کو بھی نہیں
دماغ لالہ و سروسمن تو کیا ہو گا

اداس اداس فضائیں دھواں دھواں منظر
اگر یہی ہے بہار چمن تو کیا ہو گا!

کسی سے حسن توقع نہ چاہیئے عاقل
بدل سکے جو نہ وہ بھی چلن تو کیا ہو گا

بہاولپور
۱۹۵۴ء

اذن محبت عام ہے یارو جذب محبت عام کریں
ہم بھی تہی اس میخانے میں آؤ کہ دو اک جام کریں

ایک لطیف سی برق تبسم ہلکی سی ایک جنبش چشم
آپ حضور اب دیکھتے کیا ہیں دل کا کام تمام کریں

کیوں نہ تمہیں ہم یاد کریں ہر آنسو پر ہر نالے پر
بھیگتی گاتی آج کہ یہ شب کیوں نہ تمہارے نام کریں

رات کو رونا دن کو رونا قسمت میں جب لکھا ہے
پھر کیا تم کو اس سے غرض ہم صبح کریں یا شام کریں

یوں چپ بیٹھے بیٹھے عاقل کب تک عمر گزاریں گے
دل کی خاک اڑا کر ہم بھی دل والوں میں نام کریں

بہاولپور
۱۹۵۴ء

جرأت دید نہیں اذن ملاقات نہیں
قسمت عشق میں پھر کیا ہے اگر مات نہیں

کون ساون مرا آرام و سکوں سے گزرا
کون سی رات مجھے تلخیٔ حالات نہیں

میرے احساس میں شامل ہے ابھی تلخیٔ غم
میرے حالات ابھی آپ کے حالات نہیں

آپ اب ہوش میں آئے ہیں ذرا غور کریں
مجھ سے غصہ میں کہی آپ نے کیا بات نہیں

آپ سے اور بھی لوگوں کو شکایت ہے حضور
شاکیٔ جور و جفا ایک مری ذات نہیں

یوں حوادث نے محبت میں کیا ہے پامال
اب تو باقی بھی کہیں دل کے نشانات نہیں

آج کیا بات ہے مائل بہ کرم ہیں وہ لوگ
جن سے عاقل ہمیں امید عنایات نہیں

بہاولپور
۱۹۵۴ء

مرے گلستان دل نے جو خزاں کا روپ دھارا
یہی چند سرد آہیں مرا بن گئیں سہارا

غم عشق نے صدا دی مجھے درد نے پکارا
مری اے حیات رنگیں مجھے چھوڑ دے خدارا

ترا حسن خود نگر بھی تجھے خود نہیں گوارا!
کہ فروغ ہر سحر کو سر شام ہی سے مارا

یہ درست ہے کہ اے دل تجھے دید کی ہوس ہے
تو بتا کہ کیا کرے گا جو نہ ہو سکا نظارہ

وہ جو ایک حشر پیہم مرا شوق بیکراں تھا
ترے جلوہ نظر کو اسی شوق نے سنوارا

تری ہر ادائے کافر مری زندگی ہے ظالم
مرا ایک شیشہ دل نہ ہوا تجھے گوارا

نہ خوشی کسی کرم کی نہ غم ستم ہے عاقل
ابھی بحر زندگی ہی نہیں بحر بے کنارا

بہاولپور
۱۹۵۴ء

دل کی بپتا سنتے سنتے ہوش گئے اوسان گئے
مان گئے ہم اے غم جاناں ہاں غم جاناں مان گئے

چوٹ پڑی نظروں کی دل پر اور یہ شیشہ ٹوٹ گیا
جتنے بھی ارمان تھے دل میں حسن کے سب قربان گئے

آپ کے حکم سے طور پہ پہنچے دار و رسن پر اف بھی نہ کی
آپ نے جو کچھ بھی فرمایا آپ کے بندے مان گئے

عقل نے ایک نہ پار لگائی ضبط نے دامن چھوڑ دیا
آہستہ آہستہ آخر ہوش کے سب سامان گئے

اہل جنون کیوں موسم گل میں چاک گریباں نکلے تھے
دنیا والے خاک نہ سمجھے ہم سب کچھ پہچان گئے

چھیڑ نہ کر اے ذوق نظارہ اگلی سی وہ بات کہاں
شوق کے ساحل بیٹھ گئے ارمانوں کے طوفان گئے

دیکھئے عاقل شومئ قسمت اور کہاں لے جاتی ہے
صحن چمن میں بھی رہ دیکھا دشت میں بھی مہمان گئے

بہاولپور
۱۹۵۴ء

خرد کے تیور نڈھال سے ہیں جنوں کی ہیں بیقرار آنکھیں
عجیب حالت بنی ہوئی ہے ہوئی ہیں جس دن سے چار آنکھیں

عجب ہے زلف دوتا کا منظر گھٹا سی بل کھا رہی ہے رخ پر
حیا نے چھیڑا ہے کوئی نغمہ بجا رہی ہیں ستار آنکھیں

جنوں کو ممنون کر رہی ہی خرد کو پاگل بنا رہی ہیں
تمہاری بے ساختہ ادائیں تمہاری بے اختیار آنکھیں

رخ حسیں پر مچل رہا ہے شباب و وارفتگی کا عالم
تمام صہبا فروش نظریں تمام بادہ گسار آنکھیں !

نفس نفس مشکبو و عنبر نگاہ میں بے خودی کے منظر
ہر اک ادا جذب دل کی مظہر حیا کی آئینہ دار آنکھیں

خزاں کی آمد سے گلستاں میں کلی کلی تھرتھرا رہی ہے
چمن کے انداز کہہ رہے ہیں دکھا رہی ہے بہار آنکھیں

نظر میں ہے وہ سرور عاقل کہ ہر کوئی مست ہو رہا ہے
شراب تقسیم کر رہی ہیں لٹا رہی ہیں خمار آنکھیں

لاہور
۱۹۵۳ء

شکوہ کم نگہی چشم عنایات سے کیا
واسطہ ہو بھی تو خورشید کو ذرات سے کیا

آپ کو مجھ سے غرض کام مری ذات سے کیا
میری اوقات ہی کیا ہے مری اوقات سے کیا

لطف اے دوست تصور کی ملاقات سے کیا
ٹوٹ جاتے ہی طلسمات طلسمات سے کیا

میں سردار بھی کہہ دوں گا جو کہنا ہے مجھے
آپ مانیں کہ نہ مانیں مجھے اس بات سے کیا

یہ جو کچھ لوگ ہیں افسردہ و بیگانہ روش
کچھ شکایت ہے انہیں پیر خرابات سے کیا

رفتنی ہیں ترے بیمار کے انفاس اخیر
فائدہ ہو بھی تو اب ترک ملاقات سے کیا

کوئی پوچھے تو سہی شیخ حرم سے عاقل
آپ فرمائیں گے رندان خرابات سے کیا

بہاولپور
۱۹۵۳ء

نہ پوچھیئے کہ ہے کیا حال ناشکیبائی
کسی کا نام لیا تھا کہ آنکھ بھر آئی

شرار ہو کے اٹھی برق بن کے لہرائی
اس اہتمام سے ہم تک نگاہ یار آئی

ہر التماس محبت نظر سے ٹھکرائی
کوئی ادا دل بے تاب کی نہیں بھائی

نقاب جلوہ ہے خود ان کی دید کا عالم
فروغ حسن میں گم ہو گئی ہے بینائی

مری نحیف نگاہی کو کس نے تھام لیا
نگاہ ڈوبنے پائی نہ تھی ابھر آئی

خدا کے واسطے جلووں کو بے نقاب کرو
جنون عشق کی ہونے لگی ہے رسوائی

نہ پا سکا کوئی دنیائے آب و گل کا سراغ
ہزار سر پھرے اٹھے ہزار سودائی

نہ لاؤ دل میں شرارت کہ ہم نہیں دشمن
نبھاؤ شرط محبت کہ ہے شناسائی
جواز بادہ پرستی کا خود ملے گا تمہیں
نگاہ میکدہ بر دوش اگر ادھر آئی
وصال سے بھی سوا راحتیں فراق میں ہیں
اب اک حسین تصور ہے اور تنہائی
تری نظر کے اشارے ہیں اور اہل جنوں
نہ فکر جیب و گریباں نہ خوف رسوائی
ہیں آج تک بھی دل و دیدہ منتظر اس کے
اک اجنبی سے ہوئی تھی کبھی شناسائی
رکھا جو عشق نے آئینہ روبرو عاقل
رخ حبیب سے شرما گئی خود آرائی

بہاولپور
۱۹۵۴ء

نہ دشت میں نہ سر کوہ طور ہوتا ہے
وہ سانحہ کہ جو تیرے حضور ہوتا ہے

جسے بھی ضبط جفا کا شعور ہوتا ہے
ترے خیال کا مرکز ضرور ہوتا ہے

ترا خیال اگر دل سے دور ہوتا ہے
وفا کا نقص طلب کا قصور ہوتا ہے

بنام زہرہ جبیناں بیاد ماہ وشاں
سکون اے دل مضطر ضرور ہوتا ہے

یہی طلب تھی کہ جس سے چراغ طور جلا
یہیں سے شام بلا کا ظہور ہوتا ہے

خوشا وہ مے کہ جو ملتی ہے بے طلب ہم کو
زہے نصیب کہ کیا کیا سرور ہوتا ہے

وہ جب بھی کرتے ہیں عاقل کوئی ستم ایجاد
ہمارا ذکر وفا دور دور ہوتا ہے!

بہاولپور
۱۹۵۳ء

وحشت سے تار تار گریباں کئے ہوئے
پھر چل دیا ہوں قصد بیاباں کئے ہوئے

پہنچے حضور دوست یہ ساماں کئے ہوئے
مضراب شوق تار رگ جاں کئے ہوئے

پھر آرہا ہے کوئی بصد احترام عشق
چہرہ کو نذر حسن پشیماں کئے ہوئے

وہ جھانکتا ہے کوئی لب بام سوئے غیر
اک اہتمام زلف پریشان کئے ہوئے

عاقل مزاج دہر سے فرصت کہاں کہ ہم
"بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" غالب

لاہور مئی ۱۹۵۲ء

وہ جو کل تھا وہی دستور جہاں آج بھی ہے
یہ زمیں قتل گہہ غم زدگان آج بھی ہے

مغتنم آج بھی ہیں غمزہ فروشان جمال
دل کی روداد حدیث د گراں آج بھی ہے

وہ جو معتوب حوادث تھا وہی قلب حزیں
رہن فرقت ہدف جور بتاں آج بھی ہے

آج بھی ہے وہی جذبات کی دیوانہ گری
اوج پر وحشت آتش نفساں آج بھی ہے !

کل بھی آلام کے انداز کہاں بدلے تھے !
ظلم اب تک ہے وہی آہ و فغاں آج بھی ہے

اک چبھن سی تھی جو سینے میں وہ باقی ہے ابھی
وہ جو تھی اک خلش درد نہاں آج بھی ہے

چشم مشتاق کہ تھی پرسش غم پر گریاں
عرض احوال پہ خونابہ فشاں آج بھی ہے

دل کے مختار ابھی تک ہیں وہی زہرہ جبیں
دل کی قیمت نگہ ماہ و شاں آج بھی ہے
تیرا غم آج سے پہلے بھی تھا مختار حیات
تیرا غم باد شہ کشور جاں آج بھی ہے
جیسے اس خاک میں پوشیدہ ہوں انوار قمر
مجھ کو ذروں پہ ستاروں کا گماں آج بھی ہے
میں نے تسخیر حوادث کی قسم کھائی تھی
وہی جذبہ مری عظمت کا نشاں آج بھی ہے
ایک افسوں ہے یہ صدیوں کا تسلسل عاقل
اک معما یہ جہاں گذراں آج بھی ہے

لاہور

۱۹۵۲ء

مذاق عشق بحسن تمام پیدا کر
وہ نام جس سے ہو پیدا مقام پیدا کر

سرود رفتہ کے نغمے رباب نو پہ نہ چھیڑ
نئی امنگ نرالا کلام پیدا کر ! ! !

وہ رہگذار وفا ہو کہ منزل جاناں
اسی دیار محبت میں نام پیدا کر

پھر ایک بار زمانے کی آگہی کیلئے
شراب و شیشہ و مینا وجام پیدا کر

مٹا کے دیر و حرم کے تخیلات دوئی
بس ایک تصور بے صبح و شام پیدا کر

ابھی مذاق طلب ذوق آشکار نہیں
جگر سے درد نظر سے کلام پیدا کر !

نہ مانگ دہر سے عاقل کوئی مقام وفا
جو ہو سکے تو محبت میں نام پیدا کر

طرحی مشاعرہ دیال سنگھ کالج لاہور
۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء

دیا غم نے نگاہ شوق کو درس وضو برسوں
نماز دل رہی مرہون صہبا و سبو برسوں

وہ خود پردوں سے اٹھ کر سامنے آئیں تو ہم جانیں
تصور میں رہی ہے یوں تو ان سے گفتگو برسوں

چمن میں مدتوں ہو گا شہید ناز کا ماتم
رہے گی خون دل کی لالہ و گل میں نمو برسوں

گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی نہیں جاتی
نہیں ہوتا نہیں ہوتا بہاروں سے رفو برسوں

نہ جانی تھی بالآخر ان کی دشمن دوستی عاقل
اٹھاتے بھی اگر ہم تنگی چشم عدو برسوں

لاہور

۱۹۵۲ء

ہر مشکلِ حیات کے قابل کہیں جسے
میرا ہی دل ہے آپ مرا دل کہیں جسے

صہبا فروشِ چشمِ محبت وہی تو ہے
وہ اک نظر کہ پردہ حائل کہیں جسے

اک آرزو کہیں جسے میری متاعِ دل
اک دل ہے کائنات کا حاصل کہیں جسے

کشفِ نیاز و رمزِ حقیقت سے کم نہیں
حسنِ مجاز جلوہ باطل کہیں جسے

تم پر نثار ہاں وہ تمہیں پر نثار ہے
منصور سوگوار کہ عاقل کہیں جسے

لاہور

۱۹۵۲ء

زمین تک ہے زماں تک ہے حد کون و مکاں تک ہے
محبت ہی محبت جلوہ فرما ہے جہاں تک ہے

تصور میں جو شوخی ہے وہ سب حسن بتاں تک ہے
تخیل کی یہ رعنائی نگاران جواں تک ہے

ظفر مندان راہ شوق اس نکتہ کو کیا سمجھیں
اگر کچھ کامیابی ہے تو سعی رائیگاں تک ہے

محبت میں اس اک دل پر ہیں، ذمہ داریاں کتنی
سپرد دل غم دل ہی نہیں کار فغاں تک ہے

ابھی اے راز داں کچھ ہم نشینوں ہی میں چرچے ہیں
مجھے اب دیکھنے دے مری رسوائی کہاں تک ہے

وہ کیوں مغرور ہو جائے نہ اپنی خوش نصیبی پر
جسے بھی باریابی درگہ پیر مغاں تک ہے

چمن میں ایک سناٹے کا عالم ہے جدھر دیکھو
نہ جانے کس لئے چپ عاقل رنگیں بیاں تک ہے

لاہور ۱۹۵۱ء

نہ اب فریاد سنتا ہے نہ کوئی داستاں میری
وطن سے کھینچ کر تقدیر لائی ہے کہاں میری

یہی بہتر ہے رہنے دو نہ کھلواؤ زباں میری
کہانی ضبط غم کی ہے قیامت کا نشاں میری

حضور دوست کیا کیا ہیں تہی دامانیاں میری
نہ میری زندگی میری نہ میری داستاں میری

انہیں دو چار تنکوں پر فلک نے برق لہرائی
یہی دو چار تنکے تھے بنائے آشیاں میری

وہیں سے موج طوفاں جانب ساحل پلٹ آتی
جہاں بھی ڈوب جاتی کشتی عمر رواں میری

اگر ساکت ہیں لب نظریں تو ہیں مصروف گویائی
محبت بندہ پرور اور کیا ہو گی عیاں میری

عبارت ہے انہی کے دم سے میرا ہر نفس عاقل
یہ سب ان کی حکایت ہے کہانی ہے کہاں میری

طرحی مشاعرہ دیال سنگھ کالج لاہور
۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء

حسن ہر رنگ غم عشق کا عنواں نکلا
ہم جسے کچھ نہ سمجھتے تھے وہ طوفاں نکلا

قیس گو اپنی محبت میں نمایاں نکلا
ایک بھی دل سے نہ کم بخت کے ارماں نکلا

عشق خود اپنی تباہی پہ پشیماں نکلا
جو بھی غم تھا وہ غم گردش دوران نکلا

کیا جو دنیا سے بشر بے سرو ساماں نکلا
یوں نکلنے کو تو جنت سے بھی انساں نکلا

قلب مجروح عجب نقشہ حیراں نکلا
دشت کا دشت گلستاں کا گلستاں نکلا

جان دیتے ہی تجھے پا لیا ہم نے اے دوست
کام مشکل جسے سمجھے تھے وہ آساں نکلا

کھینچ لایا تیرے عشاق کو پھر برسردار
دل گرفتار تنگ ظرفی عرفاں نکلا

حسن بے درد کبھی درد کا درماں نہ ہوا
پھول تو گریۂ شبنم پہ بھی خنداں نکلا

ساتھ کوئی بھی مرا دے نہ سکا شامِ الم
اشک تک دیدۂ پرنم سے گریزاں نکلا

رسمِ فرقت نگہِ شوق کو تڑپا نہ سکی
رنگِ تصویر تصور میں نمایاں نکلا !

ماورا عقل سے اندازِ جنوں ہیں عاقل
"قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" غالب

طرحی مشاعرہ، لاہور
۱۹۵۱ء

زیست اور موت کے ساماں بدل جاتے ہیں
دیکھتے دیکھتے عنوان بدل جاتے ہیں

کفر وہ چیز ہے ایمان بدل جاتے ہیں
بات کہنے کی نہیں مان بدل جاتے ہیں

کس سے بے مہری احباب کا شکوہ کیجئے
کس سے کہیئے کہ یہ انسان بدل جاتے ہیں

عارضی قصر محبت میں چراغاں کر کے
دیکھتے دیکھتے مہمان بدل جاتے ہیں

ضبط بیداد نہیں وجہ شکایت عاقل
وہ تو کافر ہے مسلمان بدل جاتے ہیں

لاہور

۱۹۵۱ء

منزل عشق میں مرا طرز قیام اور ہے
حسن کی کائنات میں دل کا مقام اور ہے
میکدہ نیاز میں میکش ناز ہیں بہت
بادہ کش فراق کا مقصد جام اور ہے
شیخ حرم نشیں میں ہے نخوت بندگی ابھی
اس کا مقام ہے کچھ اور میرا مقام اور ہے
ان کی نظر کشی نہ پوچھ اے غم ماسوا نہ چھیڑ
نطق وفا تو اک طرف طرز کلام اور ہے
اہل وفا جو ہو تو دیکھ اہل جنوں جو ہو تو سن
عاقل بادہ مست کا طرز کلام اور ہے

لاہور
۱۹۵۱ء

شکست ہر قدم پر عزم مستقبل بدلتے ہیں
تری منزل کے دیوانے کہیں منزل بدلتے ہیں
ابھی تدبیر سے تقدیر مستقبل بدلتے ہیں
سنبھل اے گردش دوراں کہ ہم منزل بدلتے ہیں
بدل جانے سے بھی جلوؤں کی ارزانی نہیں جاتی
کنارہ وہ غلط کرتے ہیں لاحاصل بدلتے ہیں
رخ روشن سے جلوؤں کے عوض ہی وہ نقاب الٹیں
ہم اس بدلے پہ بھی خوش ہیں اگر وہ دل بدلتے ہیں
انہیں کے دم سے روشن ہیں ابھی تک طور کے جلوے
ترے انکار پیہم سے کہیں سائل بدلتے ہیں
انہیں پھر بحر غم کی موت بھی راس آ نہیں سکتی
برا کرتے ہیں جو خود داری ساحل بدلتے ہیں
وہ کل تک جن پہ تم کو ناز تھا دعویٰ تھا یاری کا
بھری محفل میں تم سے آج اے عاقل بدلتے ہیں

لاہور
۱۹۵۰ء

تسکین قلب وجاں کے سہارے بچھڑ گئے
نظروں کے ساتھ ساتھ نظارے بچھڑ گئے

گر گر کے آنسوؤں نے زمیں پر پناہ لی
مل مل کے آسماں سے ستارے بچھڑ گئے

طوفاں کی زد پہ لا کے سفینے ڈبو دیئے
دامن بچا کے ہم سے کنارے بچھڑ گئے

وہ اضطراب شوق کی نیرنگیاں کہاں
جو دن بھی ان کے ساتھ گزارے بچھڑ گئے

کوئی نہ دے سکا مری تنہائیوں کا ساتھ
تنگ آ کے ظلمتوں سے ستارے بچھڑ گئے

کہدے کوئی اب ان سے یہ عاقل دم وداع
لو آج تم سے دوست تمہارے بچھڑ گئے

لاہور
۱۹۵۰ء

شکیب چھین لیا اختیار لوٹ لیا
تری نگاہ نے بیگانہ وار لوٹ لیا
سجائے تھے ابھی تنکے مگر ہواؤں نے
وہ آشیاں ہی سر شاخسار لوٹ لیا
گلوں کے رنگ اڑے ہیں یہ کس کی آمد سے
یہ کس نے قافلہ نوبہار لوٹ لیا
یہ دل تو تھا ہی تمہارا یہ کس لئے تم نے
نظر سے آپ ہی کرکے شکار لوٹ لیا
کس اعتبار پہ عاقل اب اعتبار آئے
کہ راہبر نے سر رہگزار لوٹ لیا

لاہور

۱۹۵۰ء

پیمانہ کش بادہ انگور نہیں ہوں
اس عجز تمنا پہ بھی مغرور نہیں ہوں
کونین پہ بھاری ہے مری چشم تصور
ہوں دور بہت تجھ سے مگر دور نہیں ہوں
غم یوں تو بہت مجھ کو زمانے نے دیئے ہیں
اک تیری تمنا ہے کہ رنجور نہیں ہوں
مجھ سے نہ گلا کر مری آشفتہ سری کا
یہ سچ ہے کہ میں واقف دستور نہیں ہوں
آسودہ ہوں میں غم کدہ بے طلبی میں
میں خوش ہوں کہ آفت نگر طور نہیں ہوں
میں اور مری فکر زمانے سے جدا ہے
میں ہجر سے مسرور ہوں رنجور نہیں ہوں

لاہور ۱۹۵۰ء

وہ آئے حریم محبت میں آئے
نظر بہکی بہکی قدم ڈگمگائے
مریض شب غم نے آنسو بہائے
ستارے بہت صبح دم جھلملائے
محبت کے رنگیں مقام اللہ اللہ
کہیں برق و باراں کہیں دھوپ سائے
اکیلے میں پہروں اکیلے میں اکثر
بدل جانے والے بہت یاد آئے
زمانے میں عاقل چراغ محبت
کسی نے جلائے کسی نے بجھائے

لاہور

۱۹۵۰ء

عالم تمام زیر و زبر دیکھتے رہے
کیا قہر تھا کہ ان کی نظر دیکھتے رہے

بن کر ترے حضور سراپا نگاہ شوق
جلوے بہ احترام نظر دیکھتے رہے

ظلمت نصیب چاند ستاروں کو دیکھ کر
انجام آفتاب سحر دیکھتے رہے

چہرے پہ تھا نقاب تجلی پڑا ہوا !
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

واقف نہ تھے سیاق وسباق جہاں سے ہم
گردش میں صرف شام وسحر دیکھتے رہے

شعلہ بکف تھے ہم سر میخانہ اور وہ !
مست انکھڑیوں سے رقص شرر دیکھتے رہے

کاٹی گئی زباں تو کہیں سر قلم ہوئے
کیا کیا مآل عرض ہنر دیکھتے رہے

ساحل پہ ہار بیٹھے ہیں ہمت کہ جن کو ہم
طغیانیوں میں سینہ سپر دیکھتے رہے
کچھ تھے جو بحر غم سے نبرد آزما ہوئے
کچھ لوگ دور ہی سے مگر دیکھتے رہے
شکوہ کسی سے کیا ہو شکایت کسی سے کیوں
قسمت میں جو بھی تھا وہ اگر دیکھتے رہے
تصویر میں سما کے تصور کی وسعتیں
آئینہ مثل آئینہ گر دیکھتے رہے
ہر شاخ گل کو ہم نے گلے سے لگا لیا
کیا خواب تھے کہ زندگی بھر دیکھتے رہے
عاقل انہیں کے قدموں میں منزل ملی جنہیں
ہر رہگذر میں خاک بسر دیکھتے رہے

لاہور
۱۹۴۹ء

قصہ عشق و وفا ورد زباں ہوتا رہا
ذکر میرا کارواں در کارواں ہوتا رہا
بجلیاں آغوش گردوں میں جواں ہوتی رہیں
اور ادھر تیار اپنا آشیاں ہوتا رہا
جیسے جیسے وسعت شوق سفر بڑھتی گئی
جادہ منزل غبار کارواں ہوتا رہا
وائے قسمت ہر قدم ہوتے گئے منزل سے دور
ہر قدم پر گو کہ منزل کا گماں ہوتا رہا
خود فریبی کا بھی کیا عالم تھا اے عاقل کہ جب
ان سے ہر لحظہ محبت کا گماں ہوتا رہا

لاہور

۱۹۴۹ء

کرم نہیں ہے عطا نہیں ہے نوازش اعتنا نہیں ہے
اب ایسے رہتے ہیں ہم سے جیسے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے
میں جانتا ہوں مری محبت جو در خور اعتنا نہیں ہے
تجھے یقیں ہے مری نظر میں تصور ماسوا نہیں ہے
یہ سب تری دین ہے خدایا یہ سب تری رحمتیں ہیں مالک
وہ درد ہم کو عطا ہوا ہے کہ جس کی کوئی دوا نہیں ہے
مجھے یہ ڈر ہے کہیں ڈبوئے نہ تجھ کو تیری یہ خود نگاہی
کوئی بھی تیری نظر میں زاہد ترے سوا پارسا نہیں ہے
معاملات دل ونظر میں جنوں سا رہبر کہاں ملے گا
نہ ہو پریشان رہ نوردو خرد اگر رہنما نہیں ہے

ترے ستم کا تو پوچھنا کیا ترا کرم بھی ہے بار دل پر
میں اس مقام طلب میں ہوں اب جہاں کوئی مدعا نہیں ہے

خبر کسے ابتداء کی ہوتی پتہ کسے انتہا کا چلتا
ہوا ہے کچھ حادثہ ہی ایسا کہ جیسے کچھ بھی ہوا نہیں ہے

میں اس خرام حسیں کے صدقے لطافت ہر قدم کے قرباں
وہ فرش دل سے گزر رہے ہیں ذرا بھی آواز پا نہیں ہے

یہ آج کے دوست کل کے دشمن یہ ناصح خوشہ چین خرمن
میں کیسے کہہ دوں کہ کوئی عاقل یہاں مرا آشنا نہیں ہے

لاہور ۱۹۴۹ء

سرِ مقتل جو اے ہمدم پریشاں روزگار آئے
وفا کا آخری یہ بوجھ بھی سر سے اتار آئے
اسی بے ساختہ پن کا محبت نام ہے شاید
کسی کا لب پہ آئے نام اور بے اختیار آئے
تجھے پاکر بھی تجھ سے بے رخی برتی تری خاطر
یہ کیا کم ہے کہ ہم جیتی ہوئی بازی بھی ہار آئے
محبت کی نہ جانے کون سی منزل ہے اے ہمدم
ہزاروں منزلیں گزریں ہزاروں رہگذار آئے
بہت دشوار تھیں راہیں حرم سے تابہ میخانہ
ہمیں مست مے غم تھے کہ عاقل بار بار آئے

لاہور

۱۹۴۹ء

برق تجلیات مجھے یاد آگئی
پھر چشم التفات مجھے یاد آگئی

دل پھر کچھ اس طرح سے ہے آمادہ وفا
جیسے کسی کی بات مجھے یاد آگئی

ایوان قلب وجاں کی تباہی کو دیکھ کر
روداد سومنات مجھے یاد آگئی

دل کی خلش نظر کی تڑپ اور شب فراق
دنیائے حادثات مجھے یاد آگئی

ہنگام صبح ڈوبتے تاروں کو دیکھ کر
عاقل وہ ایک رات مجھے یاد آگئی

لاہور

۱۹۴۹ء

منت حسن یار کون کرے
عشق کو بے وقار کون کرے
ہو بھی کس سے شکایت ہستی
شکوہ روزگار کون کرے

ابر صہبا بدوش ہے رقصاں
رقص مستی سے عار کون کرے
ہم ہی شوریدہ سرغنیمت ہیں
ورنہ جشن بہار کون کرے

زلف ساقی بکھر چلی عاقل
اب تمنا فگار کون کرے

لاہور

۱۹۴۹ء

عنواں کے ساتھ ساتھ فسانہ بدل گیا
وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

وہ آئے اور حیات کی صورت بدل گئی
بیگانہ وار قلب یگانہ بدل گیا

بے نور ہوگیا مرا ایوان زندگی
نیرنگ روز لطف شبانہ بدل گیا

دنیا بدل گئی مرے عیش ونشاط کی
عیش ونشاط ہی کا زمانہ بدل گیا

الفت کی رسم و راہ خدا جانے کیا ہوئی
آنکھوں کا گیت دل کا ترانہ بدل گیا

یا میرے زخم دل کا مقدر نہ تھی وہ چوٹ
یا آپ کی نظر کا نشانہ بدل گیا

عاقل ہزار ہم نے جتائی وفا کی بات
کوئی حسین بھی تو نہ مانا بدل گیا

لاہور
۱۹۴۹ء

وہ جو صبر آزما نہیں ہوتا
درد دل بھی سوا نہیں ہوتا

میرے دل کو تجھی سے نسبت ہے
غم خوشی سے جدا نہیں ہوتا

یہ محبت بھی اک عجب شے ہے
اس محبت میں کیا نہیں ہوتا

میں نے سمجھا تجھے غلط اے دوست
کوئی اچھا برا نہیں ہوتا

سچ تو یہ ہے کہ جان دے کر بھی
موت کا حق ادا نہیں ہوتا

ہائے کس منہ سے ہو شکایت غم
درد الفت رسا نہیں ہوتا
مونس غم رفیق تنہائی
کوئی تیرے سوا نہیں ہوتا
آج ہی کیوں اداس ہو عاقل
کب وہ تم سے خفا نہیں ہوتا

لاہور

۱۹۴۹ء

سود اے آہ نارسا کیا ہے
درد ہجراں تری دوا کیا ہے
میں دعا بھی کروں تو کس منہ سے
بندگی میری اے خدا کیا ہے
اک سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا
اب محبت کا آسرا کیا ہے
یا تھا اک شور یا یہ سناٹا
ابتداء کیا تھی انتہا کیا ہے
چند آنسو تھے وہ بھی خشک ہوئے
دامن دل میں اب رہا کیا ہے
حال دل ہم نہ کہہ سکے عاقل
وہ نہ سمجھے کہ مدعا کیا ہے

لاہور

۱۹۴۹ء

متفرقات

اے ربّ جہاں

اے رب جہاں خواب تغافل سے جگادے
مجھ ایسے گناہ گار کو توفیق ثناء دے

تو مالک ومختار ہے ہر شے پہ ہے قادر
تو چاہے تو بگڑی ہوئی ہر بات بنادے

پوشیدہ ہے کب تجھ سے مرا حال پریشاں
تو جانتا ہے ایسے تہی دست کو کیا دے

میں عاجز وشرمندہ ہوں کس منہ سے میں مانگوں
تو وہ ہے کہ چاہے تو طلب سے بھی سوا دے

ذرہ ہو کہ کہسار وہ قطرہ ہو کہ قلزم
قسمت کی ہے یہ بات جسے چاہے خدا دے

اکرام سے بھر دے مرے افلاس کا دامن
اللہ مجھے دولت کردار وفا دے

مالک مجھے احساس گنہ دے تو دیا ہے
یا رب پئے نیکی مری ہمت بھی بڑھا دے
دل کیا ہے ہوس گاہ زر ومال جہاں ہے
جب تک کہ نہ تو حوصلہ صبر ورضا دے
کونین سمٹ آئیں جو دے اذن سفر تو
لمحات ٹھہر جائیں جو تو انؐ کو صدا دے
جاکر تیرے محبوبؐ کے قدموں میں گروں میں
محشر میں مجھے دے بھی تو وہ لغزش پا دے
یا رب تری رحمت کا طلبگار ہے عاقل
مولا تو اسے دولت تسلیم و رضا دے

اسلام آباد
اگست ۱۹۹۱ء

نعت

زباں پر محمدؐ کا نام آ رہا ہے
تمنا کو لطف کلام آ رہا ہے
جھکی جارہی ہیں ادب سے نگاہیں
نبوت کا ماہ تمام آ رہا ہے
فضاؤں میں لہرا رہا ہے ترنم
تکلم بصد احترام آ رہا ہے!
اٹھو قیصری تمکنت رکھنے والو
کہ درویش عالی مقام آ رہا ہے
خدا کا پیمبر خدائی کا ہادی
محبت کا لے کر پیام آ رہا ہے
منظم منظم ہے پہنائے عالم
کہ شہباز شائستہ کام آ رہا ہے

کھلا جارہا ہے تخیل میں کوئی
نفس در نفس صبح و شام آ رہا ہے
محمدؐ کا اسم گرامی ہے لب پر
درود آرہا ہے سلام آ رہا ہے

نعت

ان کی رضا رضائے حق سر کو جھکا کے دیکھیے
دیکھیے کیا نہیں وہاں لو تو لگا کے دیکھیے

سینہ راز بھی ہیں وہ رنگ مجاز بھی ہیں وہ
پردہ اگر نہ اٹھ سکے پردہ گرا کے دیکھیے

دل سے اٹھے گی اک صدا صلی علیٰ محمدؐ
سویا ہوا ہے دل اگر دل کو جگا کے دیکھیے

روح وبدن کے فاصلے ان کے یہاں روا نہیں
ہوش اڑے ہوئے سہی ہوش میں آکے دیکھیے

سوز دروں بھی ساتھ ہو اپنے تو کوئی بات ہو
آگ ابھی لگی نہیں آگ لگا کے دیکھیے !

کیجئے تو اپنی ہر خطا نذر شفاعت وعطا
ان کے کرم کا واسطہ ان کو ولا کے دیکھیے

محفل سوز و ساز میں گل کدہ حجاز میں
بے خبر ان رنگ و بو پھول سجا کے دیکھیئے

دل کی مراد پائیں گے جب وہ مدد کو آئیں گے
آپ دعا کے واسطے ہاتھ اٹھا کے دیکھیئے

بادہ کشاں ہجر و غم سامنے ہیں وہ بیش و کم
ارض مدینہ کی قسم آپ خود آکے دیکھیئے

ہجر ہے اور اندھیرا ہے دور بہت سویرا ہے
روشنی لوٹ آئے گی دل تو جلا کے دیکھیئے

موتیوں سے بھرا ہوا دامن دل جو چاہیئے
عاقل بے نوا ذرا اشک بہا کے دیکھیئے

اسلام آباد

۲۱ ستمبر ۱۹۹۲ء

نعت

دل میں اک حسرت پیہم کہ ہے جینے کیلئے
ایک روز آئے گا پیغام مدینے کیلئے

میرے آقاؐ نے بلایا ہے محبت سے مجھے
اب جو طوفاں ہے تو کیا فکر سفینے کیلئے

آنکھ اس نور سے تابندہ رہے اور یہ دل
وقف ہو ان کی محبت کے خزینے کیلئے

اس میں لگتا ہے کہ کونین سما سکتے ہیں
دل عجب مجھ کو ملا ہے مرے سینے کیلئے

ان کی محفل سے گئی تھی وہ خمار آلودہ
پھر صبا کاسہ بدست آئی ہے پینے کیلئے

بوئے گل پھرتی ہے بے تاب تمنا ہو کر
میرے مولاؑ میرے آقاؑ کے پسینے کیلئے
خاتم ارض وسما کا تھا مقدر عاقل
روز وشب گرد تھے جس ایک نگینے کیلئے

اسلام آباد

۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ء

نعت

خوشا وہ دل کہ ہے جس دل میں آرزوئے رسولؐ
زہے وہ جاں کہ ہوئی ہے فدائے کوئے رسولؐ

ہے افتخار سماعت ازل سے تابہ ابد
کہ حرف وصوت کی عظمت ہے گفتگوئے رسولؐ

رہین رحمت وبرکت ہیں آسمان وزمیں
محیط ارض وسما ہیں فیوض خوئے رسولؐ

زمیں پہ گوشہ بہ گوشہ ہے ورد صل علیٰ
فلک فلک ہے رواں موج مشکبوئے رسولؐ

وہ جس کے نور کا صدقہ ہے صبح صادق بھی
وہی ازل سے فروزاں ہے شمع روئے رسولؐ

مجھے ملی ہے بصارت بھی اور بصیرت بھی
کہ میری آنکھ کا سرمہ ہے خاک کوئے رسولؐ

زہے نصیب کہ دیکھا جنہوں نے نور ازل
خوشا وہ لوگ رہے ہیں جو رو بروئے رسولؐ

تمام جس سے زمان ومکاں مہکتے ہیں !
گلاب ومشک سے پوچھو کہ کیا ہے بوئے رسولؐ

وہ بدنصیب ہے مردود ہر زمان ومکاں
عدو خدا کا بھی ہے جو کہ ہے عدوئے رسولؐ

حد جنوں بھی اسی میں جنون بے حد بھی
شراب عشق سے لبریز ہے سبوئے رسولؐ

خدا کی ذات کا صرف ان کو علم ہے عاقل
تلاش حق سے عبارت ہے جستجوئے رسولؐ

اسلام آباد
۳۰ اگست ۱۹۹۲ء

نعت

دعائیں کب ہماری رائیگاں ہیں
محمدؐ جب ہمارے مہرباں ہیں

جبینیں جن کی زیب آستاں ہیں
وہی شاہنشہ ہر دو جہاں ہیں

زیارت کو ترستی ہیں یہ آنکھیں
حضورؐ ہر چند آنکھوں میں نہاں ہیں

جو بن جائیں چراغ راہ طیبہ
مری قسمت میں وہ آنسو کہاں ہیں

وہیں تک سر بسجدہ ہیں ملائک
جہاں تک ان کے قدموں کے نشاں ہیں

خبر کیا چودھویں کا چاند ہوں، جو!
اسیر گردش ہفت آسماں ہیں

انہیں کے دم سے ہے رونق جہاں کی
وہی تو وجہ تخلیق جہاں ہیں
انہیں کی راہ میں ہیں منزلیں بھی
کہ جن کی خضر گرد کارواں ہیں !
ابھی سے دل اٹھ آیا ہے عاقل
ابھی تو اور بھی کچھ امتحاں ہیں

اسلام آباد

۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء

سلام

حسین ابن علی ضیغم خدا کو سلام
قتیل رسم وفا پیکر وفا کو سلام

بصد ادب نگہ شوق کا سلام نیاز
بصد خلوص شہیدان کربلا کو سلام

سلام قافلہ حق کے جاں نثاروں پر
سپردگان رہ منزل وفا کو سلام

سلام تجھ کو مرا سنت براہیمی
وفا کی راہ میں ایثار بے بہا کو سلام

غریق دجلہ اشک رواں رہی کیا کیا
فرات خوں میں نہائی ہوئی قبا کو سلام

یہ آنسوؤں کی جھڑی ہے عقیدتوں کا خراج
محبتوں کا محبت کے رہنما کو سلام !

وہ جس کے عزم کی روداد زندگی ہے گواہ
اسی شہید کے ایمان برملا کو سلام
بدل کے رکھ دیئے پیمانہ ہائے فتح و شکست
محاذ عشق کے مر دان با صفا کو سلام
مرا سلام بہ آل محمدؐ عربی
مرا نواسہ محبوبؐ کبریا کو سلام

راولپنڈی

۱۳ فروری ۱۹۷۳ء

قائدِاعظمؒ

نقیب عزم و عمل فاتحِ نشاط والم
سلام پیکرِ اخلاص قائدِاعظم

ترے اصول ہیں ایمان واتحاد و نظم
ترا پیام پیامِ اخوتِ محکم!

ترے کمالِ تدبر کی مدح خواں دنیا
تری نگاہِ عزائم کا معترف عالم

بقائے ملتِ مسلم کے اے ستیزہ کار
پھر آج موڑ رہے ہیں قضا کے دھارے ہم[1]

کھلے ہیں پھول مگر فرصتِ بہار کہاں
ابھی تو تازہ ہیں سینوں میں زخمِ بے مرہم

الجھ رہے ہیں حوادث سے پے بہ پے ہم لوگ
ہماری زیست کا عنواں ہے کاوشِ پیہم

[1] سقوطِ مشرقی پاکستان کی طرف اشارہ

خدا کا شکر عدو آج بھی ہیں زیر ونگوں
خوشا کہ مرد سرفراز آج بھی ہیں ہم
غم حیات سے آنکھیں ملائے جاتے ہیں
مزاج گردش دوراں اگرچہ ہے برہم
زہے کہ آج تری پاک سرزمین کے سپوت
بلندیوں پہ پہنچنے کی کھاچکے ہیں قسم
ہزار گو نہ مصائب ہیں گو ابھی درپیش
رکے نہیں ہیں مجاہد بڑھا رہے ہیں قدم

راولپنڈی
۱۹۷۲ء

روحِ اقبالؒ سے خطاب

دل ہمہ برق بے اماں جاں ہمہ ساعقہ اثر
اے کہ تری نظر سے ہے گرمی شعلہ و شرر
تیرے لئے ہے مضطرب مہر بھی ماہتاب بھی
شب کو ہے تیری جستجو فکر میں ہے تری سحر
ہے یہ صحیفہ جہاں تیرے لئے ورق ورق
تیرے نقوش پا ابھی ڈھونڈ رہی ہے رہگذر
برہم و نا درست ہے آج نظام کائنات
تو جو نہیں تو زیست ہے تیرے بغیر بے اثر
کون ترے سوا ہوا نغمہ سرائے زندگی
کس کی صدا سے گونج اٹھے تو جو نہ تھا تو بحر وبر
فلسفہ خودی بھی کیا تیرے بغیر کچھ نہیں
کیا ترا درس عشق بھی اب نہیں درس معتبر

سوز حیات کیوں نہیں آج بھی مظہر جنوں
اٹھ گئی تیرے بعد کیا رسم و رہ دل ونظر

کیا یہی تیرے اے حکیم درس خودی کا تھا نصیب
کبر وغرور الاماں نخوت وجہل الحذر

ہم نے تری وفاؤں کا خوب تجھے صلہ دیا
دل سے ترا ہر ایک نقش محو کیا مٹا دیا

بہاولپور

۱۹۵۵ء

تعمیرِ نو

(وحدت مغربی پاکستان کے قیام سے متاثر ہو کر)

ماحول کو روشن کیا جلوؤں کو نکھارا
ظلمت کا فسوں توڑ کے کرنوں کو ابھارا
ایک بند کھلا بہنے لگا نور کا دھارا
ہر سمت تجلی ہے نظر ہو کہ نظارہ
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

اب صحن گلستاں میں صبا کھیل رہی ہے
ہر پھول میں خوشبوئے وفا کھیل رہی ہے
نغموں سے ترنم کی ادا کھیل رہی ہے
نغموں کا ترنم ہے کہ بہتا ہوا دھارا
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

گلشن کو ہے تزئین بہاراں کی ضرورت
ہر نقش کو ہے حسن نگاراں کی ضرورت
ترتیب کی تنظیم کی عنواں کی ضرورت
احساس ضرورت نے اگر اور پکارا
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

فکر من و تو رنگ بدل جائے تو اچھا
احساس دوئی دل سے نکل جائے تو اچھا
سانچے میں محبت کے جو ڈھل جائے تو اچھا
تفریق کا ہر سلسلہ تلخ وگوارا !!!!
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

اس سارے گلستاں کا ہے عنوان نظر ایک
مقصود سفر ایک ہے اور رخت سفر ایک
اے ہم وطنو ہم ملک میں ہم سب ہیں اگر ایک
مفلس ہو کہ منعم ہو سکندر ہو کہ دارا
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

مجروح و دول افگار تھی جمعیت ملت
تقسیم و حکومت کہ تھی غیروں کی سیاست
پارینہ یہ افسوس ہے اسے توڑے گی وحدت
مٹ جائے گی افراد کی تقسیم قضارا
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارہ

یہ نظم چمن صحن گلستاں کی ہے تعمیر
یہ حسن نظر تاب یہ تنویر ہی تنویر
خورشید اثر خاک کے ذرات کی تصویر
یہ دیس ہے اپنا کہ ہے جنت کا نظارا
تابندہ ہے رخشندہ ہے ملت کا ستارہ
ملت کا ستارا

بہاولپور
۱۹۵۵ء

جشنِ جمہوریۂ پاکستان

(ملک میں پہلی بار ۱۹۵۶ء میں وفاقی پارلیمانی دستور کے نفاذ پر)

چھوڑو سب دکھ درد کی باتیں گیت خوشی کے گانے دو
بیتے دن اور بیتی راتیں بھول بھی جاؤ جانے دو

آج بھی جوش عیش و طرب میں کیوں دل شبنم لرزاں ہے
کلیوں کو دو اذن تبسم پھولوں کو کھل جانے دو

رات کے تند اندھیروں سے پھر نور کے دھارے پھوٹے ہیں
ابھری ہے مینائے افق سے صبح بہاراں آنے دو

بیت گیا دور محرومی شاد ہیں اب ارباب چمن
کھینچنے دو تصویر تمنا شوق کو جشن منانے دو !

بدلی ہے رت رنگ محل کی دھوم ہے اک میخواروں میں
چھیڑ بھی دو مضراب تمنا رقص طرب فرمانے دو

ہر سو ہے اک جشن بہاراں جیب وگریباں ہنستے ہیں
جھومنے دو احساس طرب کو رنج والم مٹ جانے دو

پھر حالات کی راج پری نے دیس کا روپ نکھارا ہے
بجنے دو دل کی شہنائی دل کو گیت سنانے دو !
کیف و سرور کی بارش ہوگی رنج والم مٹ جائیں گے
یہ جو اٹھا ہے ابر بہاراں اور اسے لہرانے دو !
ٹوٹ چکا افسون خموشی ساحل ساحل جاگ اٹھے
اب احساس کے طوفانوں کو جھومنے دو اور گانے دو !

بہاولپور

۱۹۵۶ء

نذرِ زمزم

[بہاولپور سے روزنامہ زمزم کے اجراء پر
بفرمائش علامہ منظور احمد رحمت مدیر اخبار]

بے خودی کا دور ہے نوشی کا موسم آ گیا
رقص فرماؤ قدح خوارو کہ زمزم آ گیا

انتہائے شوق سے بے تاب وبرہم آ گیا
ایک ہنگامہ بزور دجلہ ویم آ گیا

شرق سے تا غرب اذن آ گہی دیتا ہوا
قیصر ملک صحافت برتر از جم آ گیا

تنگنائے فکر سے اک انگبین ناب سخن
بیشتر شیریں بہ ایں اندازہ کم آ گیا

آگیا وہ ناخدائے قلب ودانائے نظر
راس جس کو طمطراق قیصر وجم آ گیا

ختم ہو گا کج کلاہان ستم پیشہ کا دور !
عشق کے ہاتھوں میں آزادی کا پرچم آ گیا

تاجدار ارض فن وارائے علم و آگہی
ہفت اقلیم صحافت میں مسلم آ گیا

ترجمان شوق بے حد رنج وراحت کا نقیب
آگیا ہر شخص کا ہم راز وہمدم آ گیا

پھر غم جمہور کو لفظوں کے پیکر مل گئے
ہر کس وناکس کی امیدوں کا سنگم آ گیا

مل گئی چشم تمنا کو متاع نور عین
زخم جس کو یاد کرتے تھے وہ مرہم آ گیا

روح آزادی کو تھی مدت سے جس کی آرزو
مژدہ باد اے حریت کیشو وہ زمزم آ گیا

بہاولپور
۱۹۵۶ء

نغمۂ حرّیت

(۱۹۵۸ء کے انقلاب اکتوبر سے متاثر ہو کر)

اٹھائے ذوق خود آگہی نے نگاہ کے سب حجاب آخر
وہ تھا جو عنوان ہر تمنا وہ آگیا انقلاب آخر

مہیب تر ظلمتوں کے سینوں سے پھوٹ نکلی ہیں تیز کرنیں
وطن کے ذرات سے تراشے گئے تو ہیں آفتاب آخر

زہے تغیر فسردہ چہرے بھی یک بہ یک جگمگا اٹھے ہیں
فضاؤں میں مسکرا رہا ہے کوئی بصد آب و تاب آخر

شعار گلچیں سے اہل گلشن تو سخت مایوس ہو چکے تھے
کسے خبر تھی کہ آہی جائے گا گلستاں پر شباب آخر

سمندروں تک سے مل رہا ہے سکندرانہ خراج ہم کو
جو محتسب تھے وہ دے رہے ہیں نفس نفس کا حساب آخر

وہ جن کی ہر پستی عمل پر پڑے ہوئے تھے ہزار پردے
وہی زمانے کی زد پہ آئے تو ہو گئے بے نقاب آخر

عظیم تر سانحات ماضی کا ایک رد عمل ہے یہ بھی !!
نہ تھے جو تعبیر خواب ہرگز وہی ہیں محروم خواب آخر

جفا کے اطوار خود جفا ساختہ جہنم میں جل رہے ہیں
وفا شعاری پہ ہنسنے والو وفا رہی کامیاب آخر

ہمارا حق تھا ہمیں جو عزت کا تاج بخشا گیا ہے عاقل
ہماری حسرت نصیبوں کا کبھی تو ملتا جواب آخر

خیرپور میرس
یکم جنوری ۱۹۵۹ء

مجاہدینِ کشمیر کے نام

دوستو پھر غم دوراں نے پکارا ہے تمہیں
یم بہ یم شورش طوفاں نے پکارا ہے تمہیں
تم کو پھر جنت کشمیر نے دی ہے آواز
وادی شعلہ بداماں نے پکارا ہے تمہیں
سرفروشانہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بڑھو
اک چراغ تہہ داماں نے پکارا ہے تمہیں
دیکھنا وقت کی رفتار نہ تھمنے پائے
ایک مستقبل تاباں نے پکارا ہے تمہیں
ٹوٹنے ہی کو ہے افسون سلاسل یارو
اے خوشا قوت ایماں نے پکارا ہے تمہیں

رہ رو ترک سفر کا نہ ارادہ کرنا ! !
آج خود منزل جاناں نے پکارا ہے تمہیں
خرمن کفر پہ پھر بن کے گرو برق بلا !
اب نہ گھبراؤ کہ یزداں نے پکارا ہے تمہیں
تم کو دی ہے کسی مجبور قفس نے آواز
پھر کسی دیدہ گریاں نے پکارا ہے تمہیں
بڑھ کے ہرا ہر من وقت سے ٹکرا جاؤ
غیرت خون شہیداں نے پکارا ہے تمہیں
تہنیت بادکہ اے خاک نشینان وطن !
تاج و اورنگ سلیمان نے پکارا ہے تمہیں
تم کو ہمت کی قسم تم کو شجاعت کی قسم
ہمدمو آؤ کہ طوفاں نے پکارا ہے تمہیں

راولپنڈی
۱۹۶۴ء

نشریہ
ریڈیو آزاد کشمیر

وطن کے محافظوں کے نام

(۱۹۶۵ء کی ہندوپاکستان جنگ کے تناظر میں)

پیام امن ہو تم برق بے اماں ہو تم
مزاج شعلہ و شبنم کے رازداں ہو تم
تمہیں ہو ارض وطن کے محافظان جری
شجاعتوں کی درخشندہ داستاں ہو تم

بنام نور خدا ظلمتوں کو للکارا ! !
اندھیری رات میں تنویر کہکشاں ہو تم
بپھر پڑو تو حوادث بھی تھر تھرانے لگیں
اٹھ کے آؤ تو اک سیل بیکراں ہو تم !

سیالکوٹ کا رن ہو کہ خطہ لاہور
ہر اک محاذ پہ بیباک و کامراں ہو تم
ہے سومنات کی تاریخ غزنوی شاہد
بتان کفر پہ اک ضرب گراں ہو تم !

خدا گواہ کہ تم سے ہے سربلند اسلام
جو گونجتی ہے دلوں میں وہی اذاں ہو تم
وہیں وہیں خس و خاشاک کفر بہہ نکلے
مثال موجہ و طوفاں جہاں جہاں ہو تم
خوشا کہ تم سے ہے ناموس حریت قائم
زہے کہ بہر وطن فتح کا نشاں ہو تم

راولپنڈی
۱۹۶۵ء

تاشقند جانے والے پاکستانی وفد کے نام

(۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں)

گئے تو ہو ظلمتوں کے زد پر یقیں کی شمعیں جلا کے آنا
وطن کی عظمت کے پاسبانو وطن کی عظمت بڑھا کے آنا

دعائیں اہل وطن کی لے کر بہ عزم بیدار جانے والو
تمہیں قسم ہے عقیدتوں کی وطن کا سکہ جما کے آنا

صداقتوں کے امین ہو تم شجاعتوں کو ہے ناز تم پر
تم اپنے آداب صدق کیشی سے ظلم کا سر جھکا کے آنا

تمہارا مکرو ریا کے سوداگروں سے پھر سابقہ ہے دیکھو
عدو کی تازہ فریب سامانیوں سے دامن بچا کے آنا

تمہارے جاں باز برسر رزم گاہ بھی سرخرو رہے ہیں
تم اس نئی بزم میں بھی فتح وظفر کے پرچم اڑا کے آنا

کہیں مورخ تمہاری قومی مروتوں کو غلط نہ سمجھے
حقیقتوں کو جتا کے اٹھنا ضمیر عالم جگا کے آنا !

تمہارے کردار منصبی پر ہیں اہل کشمیر کی نگاہیں !
بس اب یہی کام ہے تمہارا کہ کام اہل وفا کے آنا !

راولپنڈی

۷ جنوری ۱۹۶۶ء

ارض وطن

ارض وطن کو رشک گلستاں کریں گے ہم
جاں دے کے اہتمام بہاراں کریں گے ہم

داماں اہرمن کی اڑا دیں گے دھجیاں
دشمن کا تار تار گریباں کریں گے ہم

ایماں کی قوتوں سے مٹادیں گے کفر کو
ہر نقش راستی کو نمایاں کریں گے ہم

ہم بجلیوں کی زد پہ بنائیں گے آشیاں
اظہار عزم وقوت ایماں کریں گے ہم

الجھیں گے ہر قدم پہ حوادث سے دوستو
خود کو حریف گردش دوراں کریں گے ہم

ہر آنکھ ہوگی سیل تجلی سے ہمکنار
ہر دل کو وقف شورش طوفاں کریں گے ہم
یوں بھی جبین ارض وطن کو سجائیں گے
تاروں سے نور لے کے چراغاں کریں گے ہم

راولپنڈی

۱۹۶۵ء

حلقۂ ارباب ادب کے فنکار

(یہ نظم بہاولپور میں حلقہ ارباب ادب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی)

حدیث جہد بقا قصہ نشاط والم
مرے رفیق بہر طور کررہے ہیں رقم
عروج ماہ وثریا پہ ہے نظر ان کی
بساط کاہکشاں تک ہے ان کے زیرقدم

زمام سلسلہ کائنات ان کی اسیر
انہیں کے ذہن کی میراث کاوش محکم
انہیں کے دم سے فروزاں چراغ لالہ وگل
انہیں کی فکر کا عنوان عظمت آدم !

ادب میں کاوش تخلیق کررہے ہیں یہ
شعور وفکر کے اوراق کررہے ہیں بہم

عظیم فن کے پیامی یہ نوجواں فنکار!
بہائے زندگی دل کی کھاچکے ہیں قسم

سجا رہے ہیں مضامین نو سے قصر ادب
حدیث وقت کے عنوان کررہے ہیں رقم

جو ارتقاء کی منازل میں ہے فراز نشیں
اسی تصور ہستی کو دے رہے ہیں جنم

غرض کہ زندگی دفن کے یہ علم بردار
دکھا رہے ہیں جہاں کو مجاہدات قلم

بہاولپور

۱۹۵۵ء

نام نہاد ترقی پسند شاعر کے نام

اے فرو مایہ افکار تہی دست خرد
پستی فکر کا کچھ بھی تجھے احساس نہیں
تو ابھی تک ہے اک آوارہ تخیل کا شکار
عظمت فن کا بھی نادان تجھے پاس نہیں

اپنی کیفیت ناکام کو پہچان کہ تو
ریگ ہستی میں پریشاں ہے غباروں کی طرح
مرتعش ارض حقیقت پہ ہے مانند سراب
خود مٹا جاتا ہے بے روح نظاروں کی طرح

ادب وشعر کو جو رنگ دیا ہے تو نے
وہ تری کاوش رسوا کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تری فکر نگوں سار کے خم گشتہ خطوط
خود فریبی کی تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

بہاولپور
۱۹۵۴ء

الوداع

(ناظم معارف بہاولپور خان بقاء محمد خان کی ریٹائرمنٹ پر)

الوداع اے ناخدائے عشق ودانائے بہار
رخصت اے اقلیم علم وآگہی کے تاجدار

اے کہ تیرے دم سے تھا صحن گلستاں کو فروغ
لالہ وگل کا چراغاں تھا سر ہر شاخسار

تجھ سے وابستہ تھی توقیر گل وگلزار فن !
عظمت علم وتدبر تھی تجھی سے آشکار !

اک ترے ہونے سے کس درجہ تھا ہر دل کو سکوں
ہر طبیعت کو تھی حاصل دولت صبر وقرار

لیکن اے دانائے دل اے مردم علم و یقین
آج تیرے رنج محرومی سے ہیں سب غم گسار

ایک اک دل تیری فرقت سے ہے رنجیدہ بہت
ہے وفور بے خودی سے ہر طبیعت بے قرار

ناصبوری کا یہ عالم ہے کہ ہر چشم پر آب
ہو رہی ہے بے قرار و بے شکیب واشکبار
ہم مگر مجبور ہیں سب اقتضائے وقت سے
وقت کی رفتار پر چلتا نہیں کچھ اختیار
اب ترے حق میں تری بے لوث الفت کی قسم
کچھ دعا ہے تو یہی اے مردم شائستہ کار
جانے والے عمر بھر تو شادو فرخندہ رہے
اور تیرا کوکب تقدیر تابندہ رہے

بفرمائش سید حبیب اللہ بخاری

بہاولپور
۱۹۵۴ء

اداس ہیں

ماحول رو رہا ہے نظارے اداس ہیں
تم جارہے ہو چاند ستارے اداس ہیں
صحن چمن میں تھی جو حرارت وہ اب کہاں
پھولوں میں تھے کبھی جو شرارے اداس ہیں
چھایا ہوا ہے بحر تغیر پہ اک سکوت
موجیں خموش ہیں تو کنارے اداس ہیں
ماحول کہہ رہا ہے خموشی ہے ہر طرف
نظریں بتارہی ہیں نظارے اداس ہیں
بے بس سبھی مشیت حالات کے حضور
لیکن سبھی ملول ہیں سارے اداس ہیں

جیسے خزاں نے لوٹ لیا ہو چمن کا روپ
کچھ اس طرح چمن کے نظارے اداس ہیں

تم جا رہے ہو بزمِ مہ و کہکشاں ہے ماند
اب تم نہیں تو چاند ستارے اداس ہیں

بہاولپور

۱۹۵۵ء

حدیثِ محنت

دست مزدور میں ہے قسمت عالم کی کلید
یعنی محنت کے تصرف میں ہے ہر گنج نوید
جوئے ہر شیر رواں تیشہ فرہاد سے ہے
سنگ و آہن سے تراشے گئے لاکھوں خورشید

قوت عزم و عمل سے ہوئے اوہام فنا !
ریزہ ریزہ ہوئے اک ضرب کلیمی سے صنم
جہد انساں نے حقائق کے وہ کھولے درو بام
سب محلات فسوں ڈھیر ہوئے زیرِ قدم

عہد در عہد کیا پرچم محنت کو بلند
وقت آیا تو سردار بھی محنت کش تھے
اور اب اس سے سوا کیا ہو عمل کی عظمت
میرے مولاؑ میرے سرکارؐ بھی محنت کش تھے

ان کی محنت سے زمانے کو ملا درس خودی
قلب انساں کو ملی دولت خود آگاہی!
دست مزدور میں جو برش شمشیر ہے آج
ڈھیر ہیں زیرقدم سیکڑوں تاج شاہی

اور وہ مزدور کہ جو حب وطن کا ہے امیں
رخنہ انداز وزیاں کار نہیں ہوسکتا
اس کے ہاتھوں کوئی تخریب نہیں ہوسکتی
عزم تخلیق سے بیزار نہیں ہوسکتا

نظم وایمان واخوت کا نہیں جو پابند
وہ ہے پھر قائداعظم کے وطن کا دشمن
جس کا تفریق ہو مسلک ہو بدی جس کی سرشت
خون فاسد ہے وہ ملت کے بدن کا دشمن

ایک ہی کوشش و کاوش کا نہیں ہے انداز
جن میں محنت کا سلیقہ ہے سبھی ہیں مزدور
وہ قلم کش ہوں کہ نقاش ہوں یا خشت نہاد
شعلہ کار سے ہے ان کے زمانہ پر نور

بسلسلہ ہفتلہ محنت
(پاکستان ٹیلی ویژن) کراچی
یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء

فقیر سید معز الدین (آغا جی) کی یاد میں

اعتبار شخصیت کا اک حسیں پیکر تھے وہ
صبح کی مانند اک نکھرا ہوا منظر تھے وہ
نکہت گل سے سوا رکھتے تھے اک موج نفس
نرم لہجے میں نسیم صبح کے ہمسر تھے وہ
سرمئی برسات کی رم جھم تھی ان کے پیار میں
پانیوں کو لمس فرماتی ہوئی صر صر تھے وہ
اک خنک احساس ہوتا تھا ملاقاتوں کے بعد
چاندنی میں دور تک پھیلا ہوا منظر تھے وہ
دیکھئے تو اک فقیر گوشہ گیر وکم سواد
سوچئے تو ظلمتوں میں بھی شہ خاور تھے وہ
بند کیں آنکھیں[ع1] تو اوروں کو بصارت دے گئے
ہر سخی ہر صاحب کردار سے بڑھ کر تھے وہ

ع1 آغا جی نے اپنی آنکھیں اپنی زندگی ہی میں عطیہ کردی تھیں

ایک طغیان محبت ایک طوفان وفا
ان کے پیکر میں یہ سب کچھ تھا عجب پیکر تھے وہ
دھڑکنیں دل کی بتائیں گی وہ کیا آواز تھی
آنسوؤں سے پوچھیئے کیا چیز کیا گوہر تھے وہ
اے خدائے پاک آغا جی کو جنت کر عطا
وہ بہشت ہرنظر تھے حسن ہر منظر تھے وہ
وہ نہیں عاقل تو اب محسوس ہوتا ہے مجھے
زیست جس سے ہوگئی محروم وہ جوہر تھے وہ

آغا جی کے داماد سید فہیم احمد گردیزی
کی اہلیہ اور خوش دامن کی فرمائش پر

اسلام آباد
نومبر۱۹۸۶ء

مژدۂ شوق

[ہم وطن بزرگ حافظ شفیع الدین صاحب
کی پہلی بار پاکستان میں آمد کے موقع پر]

وادیٔ ہند سے لایا ہے کوئی مژدہ شوق
پھر طربناک ہواؤں سے چمن جھوم اٹھے
خیمہ زن پھر ہوئیں گلشن میں عروسان بہار
ساز طاؤس پہ گلنار وسمن جھوم اٹھے

متحیر نظر آتی ہے گلستاں میں شمیم
پھر فضاؤں پہ محبت کا فسوں طاری ہے
جوش اظہار سے کلیوں میں مچی ہے ہلچل
رقص جاوید سے پھولوں پہ جنوں طاری ہے

بکھری پڑتی ہیں نگاہوں سے طرب کی کرنیں
ہر سخن قند فروش لب گفتار ہے آج
جذب ایثار سے معمور ہے ہر گوشہ دل
باعث لطف وکرم نازش دیدار ہے آج

منتظر جس کے تھے مدت سے سب ارباب ریاض
آج وہ مایہ ارباب چمن آپہنچا !
عصمت شوق کا پہلو میں لئے قلب سلیم
داور نطق وفا جان سخن آپہنچا

بہاولپور
مئی ۱۹۵۱ء

چٹاگانگ سے کپتائی تک

(سابقہ مشرقی پاکستان میں ایک سفر)

کل ہم عروس شہر سے دامن کشاں چلے
حسن تصورات نے پوچھا کہاں چلے

لے کر جلو میں قافلہ دوستاں چلے
بے اختیار صورت سیل رواں چلے

کیا کیا رفاقتوں نے دیئے لطف راہ میں
ہمراہ قہقہوں کے حسیں گلستاں چلے

دل تھا مصر کہ یا کوئی رشک قمر ملے
یا ساتھ ساتھ سلسلہ کہکشاں چلے

دریا کے پیچ وخم سے ملا زلف کا سراغ
ابروئے شب سے تیر کئی ناگہاں چلے

ماحول کو شفق سے سجایا تھا شام نے
ایک سیل رنگ ونور کے ہم درمیاں چلے

آئے گا یاد رقص حسینان کہتئی
لے اس زمین حسن سے اے آسماں چلے

چٹاگانگ

۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء

ناہید

پیکر ناز و ادا ہے ناہید
ہر نظر جلوہ نما ہے ناہید

سر بسر حسن ہے رعنائی ہے
زندگانی کی ادا ہے ناہید

کیف و مستی کی حدیث دلکش
ہر نفس لطف سوا ہے ناہید

میرے احساس کا عنوان حسیں
دیدہ و دل کی صدا ہے ناہید

جلوہ آرا ہے سر بزم خیال
چشم عاقل کی ضیاء ہے ناہید

۲۷ فروری ۱۹۶۶ء

محبوب واسطی کے خط کے جواب میں

حسن جذبات کی تابندہ و رخشاں تصویر
آپ کا خط ہے عنایات و محبت کی نظیر

جذب واحساس میں ڈوبے ہوئے اعراب ونقوش
کیف و مستی میں پروئی ہوئی ایک ایک لکیر

روح پرور ہے خطابت کا نرالا انداز!
دل نشیں ہے روش فکر سے طرز تحریر

معنی و لفظ میں جیسے متکلم ہے کوئی
کررہا ہے کوئی جیسے پس پردہ تقریر

نامہ شوق کا ہر لفظ حسیں ہے گویا
قلب محبوب کے اخلاص و وفا کی تفسیر

آمد خط کہ بنی میرے لئے وجہ نشاط
مل گئی مجھ کو مرے خواب حسیں کی تعبیر
آپ کا حسن توجہ ہے مرا پیار نہیں
ورنہ میں تو کسی قابل مرے سرکار نہیں

بہاولپور
۱۹۵۴ء

محبوب واسطی کے نامۂ عید کے جواب میں

نہ سہی آپ کی دید آپ کا مکتوب ملا
میں نے یہ جانا کہ گویا مجھے محبوب ملا

دل اس انداز وفا پر بخدا جھوم اٹھا
نامہ شوق بعنوان طرب خوب ملا

زندگی کیف مسلسل سے ہم آغوش ملی
جذب مانوس طلب لطف سے منسوب ملا

صاف وسادہ سی وہ تحریر وہ پیغام حسیں
جس کا ہر لفظ پسندیدہ ومرغوب ملا

جس کے پرتو سے ملی ماہ درخشاں کو ضیاء
جس کے انوار سے خورشید بھی محجوب ملا

تہنیت نامہ محبوب ملا عید کے دن
شکریہ آپ کا مکتوب ملا عید کے دن

شکریہ

اے دوست التفات و محبت کا شکریہ
پیغام عید و مژدہ راحت کا شکریہ

یہ اہتمام ذرہ نوازی زہے نصیب
اظہار لطف و حسن مروت کا شکریہ

پیغام تہنیت کا یہ اسلوب دلنشیں
اس احترام رسم و روایت کا شکریہ

تحریر رنگ و بو میں بہ پاس تعلقات
آہنگ التفات و عنایت کا شکریہ

روشن ہے رنگ گل سے نگار سحر کی مانگ
موج نسیم و باد مسرت کا شکریہ

قلب ونظر کو جنت احساس بخش دی
انداز دلفریبی فطرت کا شکریہ

کس کس طرح ہے پرسش احوال دیکھئے
کیوں کر ادا نہ کیجئے زحمت کا شکریہ

لائل پور
۷ مارچ ۱۹۶۳ء

نظم تہنیت

(مظفر ضیاء کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے پر ایک تاثر)

حیات نو کے نقیب خنداں تجھے نشاط وفا مبارک
نیاز کے پیکر درخشاں عروس ناز آشنا مبارک

مسافر نو بہار تجھ کو مبارک احساس گل بداماں
یہ وادی دلفریب ورنگیں یہ اولیں نقش پا مبارک

تری نگاہ لطیف میں ہیں نفیس تر رنگ وبو کے منظر
ترے دل فرحت آشنا کا ہو تجھ کو یہ معجزہ مبارک

ڈھلی جو فرقت کی شب تو دیکھا کہ روئے یامین تھا منور
ضیائے نجم سحر نے تجھ کو گلے لگا کر کہا مبارک

ازل سے ممتاز رہنے والے عزیمت حیدری کے پیکر
یہ حوصلہ مندی مسلسل تجھے مظفر ضیاء مبارک

تجھے کہ ہے سید بہاراں چمن کی ہر ہر کلی سے الفت
زبان سجاد پر رواں ہے نوائے بے ساختہ مبارک

خوشا ترے عزم بیکراں کو رفیق منزل کی جستجو تھی
زہے کہ قدرت نے تجھ کو اے دوست زندگی کا قرار بخشا

تجھے زمانے نے خود عطا کی مذاق خود آگہی کی دولت
ترے تصور کی رفعتوں کو سکندرانہ وقار بخشا

لطیف تر رنگ و بو کے سانچوں میں ڈھال کر شاہد معانی
حسین تر حرف آرزو کا مغنیانہ شعار بخشا

ترے دل منتظر کو بخشی گئی نشاط شکیب پیہم
تری نگاہ طلب کو پرکیف انکھڑیوں کا خمار بخشا

کسی کا احساس لطف کچھ اس طرح تصور شکار نکلا
نظر نظر جلوہ زا بنادی نفس نفس مشکبار بخشا

مبارک اے رہرو محبت تجھے تری ہمت جواں نے
حسین تر کامرانیوں کا عظیم تر افتخار بخشا

خلوص افکار کے تصدق کہ ذہن عاقل کو آج کے دن
سپاس و اظہار تہنیت کو یہ سہرہ زر نگار بخشا

پشاور
۱۹۶۴ء

سہرا

(ہمشیر زادہ عزیزی آفتاب رشید کی شادی کے موقع پر)

دعاؤں کی لوریوں کے دامن میں کب سے تھا محو خواب سہرا
فضا میں رم جھم کی رت جگانے اٹھا ہے مثل سحاب سہرا

نفس نفس مشکبو و عنبر نظر نظر ماہتاب سہرا
شمیم الطاف کا خزینہ محبتوں کا گلاب سہرا

افق کے ماتھے پہ سرخ کرنوں کا ایک جھومر سا ہے فروزاں
طلوع صبح کی ساعتوں میں ہے اک حسیں آفتاب سہرا

چمن میں کچھ اس طرح سے سرو سمن کی تنظیم ہو رہی ہے
رخ بہاراں سے دیکھتی ہے صبا الٹ کر نقاب سہرا

سجا رہا ہے یہ کون پلکوں پہ آج در دانہ ساز شبنم
یہ کس کی اختر شناس آنکھوں نے کرلیا انتخاب سہرا

مشیر فطرت نے کلک زر سے لکھا ہے افسانہ محبت
ورق ورق حسن بیکراں کی بنا ہوا ہے کتاب سہرا

چمن میں ہر سو بہار کی دید سے مشرف ہوئیں نگاہیں
سنا گیا شاخ گل کے سائے میں داستان شباب سہرا

رئیس شہر وفا نے قسمت سے پھر یہ روز سعید دیکھا
کہ سر پہ اک تاج گل سجا کر اٹھا بصد آب و تاب سہرا

بہ اوج ناہید جلوہ گر ہے ضیاء بہ دامان ہر نظر ہے
حریم خاور سے لے کے آیا جلو میں اک آفتاب سہرا

خوشا کہ شائستہ ہنر ہے زہے کہ منظور ہر نظر ہے
بہ فیض یزداں بہ فیض آنحضرتؐ رسالت مآب سہرا

تمازتوں کے سفر میں عاقل یہ راستہ گو کٹھن تھا لیکن
فضا میں ابر کرم کی صورت رہا میرے ہمرکاب سہرا

اسلام آباد
۲۵ دسمبر ۱۹۸۶ء

سہرا

(برادر زادہ عزیزی سید منور عالم کی شادی کے موقع پر)

کس کے جذبات محبت کا ہے مظہر سہرا
ماہ و اختر سے بھی بڑھ کر ہے منور سہرا

ساز جذبات پہ گائی ہوئی حافظ کی غزل
بزم خیام کا چھلکا ہوا ساغر سہرا

بربط دل پہ لرزتی ہوئی نغموں کی سی دھن
چشم ناہید سے ابھرا ہوا منظر سہرا

انگبین ناب تخیل کا نرالا شہکار
حسن کے پھول کا رس شہد کا ساغر سہرا

ہر لڑی میں ہے ریاض گل و نسرین کی ادا
پھول ہی پھول کی خوشبو ہے سراسر سہرا

باغ در باغ ہے فیضانِ نسیمِ گزراں
قلب در قلب ہے منصور و مظفر سہرا

سربلند ایسا کہ گردوں سے فزوں تر نکلا
سرفراز اتنا کہ ہر سہرے سے برتر سہرا

الغرض یاسمن وگل کی یہ ترتیب حسیں
بن گئی نغمہ و افکار میں ڈھل کر سہرا

ذوق وغالب کی زمیں اور یہ جسارت عاقل
دیکھ کیا اہل سخن کہتے ہیں سن کر سہرا

اسلام آباد

۲۱ جنوری ۱۹۸۸ء